پروفیسر

عبدالحمید صدیقی

اپنی تحریروں کے آئینہ میں

نز ۱۲۱۔ ذوالقرنین چیمبرز گنپت روڈ لاہور

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

اپنی تحریروں کے آئینہ میں

مرتبہ

پروفیسر محمد اکرام صدیقی

قاضی پبلیکیشنز
۱۲۱- ذوالقرنین چیمبرز- گنپت روڈ، لاہور (پاکستان)

اشاعت اوّل : مارچ ۱۹۸۰ء : ۱۱۰۰

طابع : پروفیسر محمد اکرام صدیقی

مطبع :

کتابت : محمد صدیق

قیمت :

اِنتساب

جناب والدِ محترم محمدؐ علی مرحُوم و مغفور کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲:۱۵۴)

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مُردہ نہ کہو
بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمھیں اُن کی زندگی کا شعُور نہیں۔

حدیثِ بندۂ مومن دلآویز
جگر پُرخُوں، نفس روشن، نگہ تیز
میسّر ہو کسے دیدار اس کا
کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز

فہرست

اشاراتِ صدّیقی

نگارشاتِ صدّیقی

تصانیفِ صدّیقی

پیش لفظ

اِس دارِ فانی میں موت ہر جان کا مقدّر ہے اور برادرِ محترم جناب عبدالحمید صدیقی نے بھی ۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء کی صُبح اپنی جان جانِ آفرین کے سپُرد کر دی مگر ان کی موت کسی فردِ واحد کی موت نہ تھی۔ مرحوم ایک فرد کے وُجود میں ایک مکمّل ادارہ تھے۔ اُن کے رخصت ہونے سے انجمن کی انجمن سُونی ہو گئی اور محفل کی محفل اُجڑ کر رہ گئی۔ بلاشبہ ملّتِ اسلامیہ کی صفیں مردانِ ایثار پیشہ اور مجُاہدینِ فی سبیل اللّٰہ سے کبھی خالی نہیں رہیں گی پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ مُسلّمہ ہے کہ ؎

ہر گُلے را رنگ و بُوئے دیگر است

بے شک برادرِ محترم کا جسدِ خاکی اب قبر میں محوِ خواب ہے لیکن اقامتِ دین کی عملی جدّوجہد میں جو نقشِ دوام انھوں نے ہمارے دلوں پر ثبت کیا ہے وہ اَنمٹ ہے۔ اُن کی زندگی اُن زندگیوں میں سے ہے جو جسم فنا ہونے کے بعد بھی زندگی سے محروم نہیں رہتیں انھوں نے اپنی مادی زندگی میں وہ بیش بہا اسلامی خدمات سرانجام دی ہیں جو زمانے کے سینہ پر خوبصورت نقش کی طرح کندہ رہیں گی اور جب تک اُن کے رشحاتِ قلم دُنیا میں محسوس اور معروف صُورت میں موجود ہیں وہ زندہ و جاوید رہیں گے۔ تاریخِ انسانی اسلام کے

اس عظیم فرزند کو کبھی فراموش نہیں کرے گی اور مستقبل کا مسلمان مجاہد ہمیشہ اُن سے سبق حاصل کرتا رہے گا۔

مرحوم بے شمار قلبی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے۔ اخلاص و مودّت کا پیکر، صبر و رضا کا مجسمہ، زہد و تقویٰ میں یکتا، ایثار و قناعت میں بے مثل، علم و عمل میں صاحبِ کمال والدین کے اطاعت شعار، بھائیوں کے مونس و غمخوار، عزیز و اقربا کے ہمدرد، دوست و احباب کے غمگسار اور خود مجھے اُن کی جو ادا سب سے زیادہ پسند تھی وہ ان کی فطری سادگی، ان کا خلوص، ان کے رہنے سہنے کا انداز اور ان کی زندگی سے بھرپور شخصیت تھی۔ مرحوم علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی زندہ تصویر تھے ؎

نرم دمِ جستجو، گرم دمِ گفتگو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

تاہم اس فقر و استغنار کے باوجود جہاں غیرتِ حق اور دینی حمیّت کا تقاضا ہوتا تو بڑی سے بڑی طاغوتی طاقت سے بھی ٹکرا جاتے۔ اس صورت میں وہ علامہ اقبالؒ ہی کے ایک اور شعر کے سراپا مصداق تھے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

برادرِ محترم کی وفات پر اندرون و بیرونِ ملک ہر مکتبِ فکر کے لوگوں جن میں علمائے کرام، فضلار، دانش وَر، مصنّف اور صحافی سبھی قسم کے لوگ شامل تھے نے اپنے اپنے انداز میں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اخبارات نے اداریے لکھے، رسائل و جرائد میں مضامین چھپے، تعزیتی قرار دادیں منظور ہوئیں اور بے شمار پیغاماتِ تعزیت موصول ہوئے۔ ان تمام مضامین کو اس کتاب میں یکجا کرنا چونکہ ممکن نہ تھا اس لیے ان مضامین میں سے چند ایک ہی شامل کتاب ہو سکے ہیں۔

مرحوم چونکہ خود شخصیت پرستی کے رجحان کو پسند نہ فرماتے تھے اس لیے اس کتاب میں آپ کی شخصیت سے زیادہ آپ کے رشحاتِ قلم کو موضوع بنایا گیا ہے اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ آپ کی تحریروں کی روشنی میں آپ کی شخصیت کو پیش کیا جائے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب محض آپ کی سوانح حیات نہیں بلکہ آپ کی تحریروں کا مجموعہ بھی ہے۔

کتاب چار حصّوں میں منقسم ہے پہلا حصّہ برادرِ محترم کی ذاتِ گرامی پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ دُوسرا حصّہ آپ کے قلم سے لکھے گئے "اشارات" میں سے اقتباسات پر مبنی ہے، تیسرے حصّے میں آپ کی نگارشات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اور حصّہ چہارم میں آپ کی تصانیف کی مکمل فہرست اور ان کا تعارف شامل ہے۔

آخر میں ہم اُن تمام حضرات کے بے حد ممنون ہیں جنھوں نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں ہماری قلمی معاونت فرمائی ہے اور اُن تمام دوستوں سے معذرت خواہ ہیں جن کے مضامین شاملِ کتاب نہیں ہو سکے۔

پروفیسر محمّد اکرام صدیقی

لاہور
جنوری ۱۹۸۰ء
بمطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۰ھ

[illegible]

اقبال مرحوم کے اس شعر کی زندہ تصویر تھے [illegible]

[illegible]

تاہم اس فقر و استغنا کے باوجود جہاں غیرت [illegible]
[illegible] طاقت سے [illegible] علامہ اقبال مرحوم کے ایک
اور شعر کے صحیح مصداق تھے

[illegible]

[illegible]

برادرِ محترم کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اس کتاب میں [illegible]
[illegible] کتاب [illegible] ہیں۔

مخدومی سلام و تحیات۔

بہترین جذبات کے ساتھ میں یہ حقیر سا نذرانہ جناب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

جو کچھ کہ خدمت ہے وہ آپ جیسے صاحب فضیلت کے کسی طرح بھی شایان شان نہیں۔ آپ اسے اپنے ایک غریب بھائی کا تحفہ سمجھ کر قبول فرما لیں۔ میں انشاء اللہ آئندہ بھی وقتاً فوقتاً یہ سعادت لیا کروں گا۔ اگر آپ کچھ لکھ لیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ چونکہ آپ نے مبادلہ کا سلسلہ چھوڑ رکھا ہے اس لئے مجھے شدید خوف محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ کام کی نوعیت ضرور آپ کے مرتبہ و مقام سے بہت کم ہے۔ مجھے محض نذرانہ سمجھ کر اسے بھی اور آئندہ کو بھی قبول فرما لیا کریں۔

والسلام

آپکا خادم

عبدالحمید صدیقی

عکس نامہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی بنام جناب ملک غلام علی صاحب

بسم اللہ

برادرم عبد الحمید صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

آپ کا ہدیۂ اخلاص (۱۰۰ روپے) موصول ہوا، جس کیلیے شکرگزار ہوں۔ میں
تو امتثال امر اور تعمیل ارشاد کے طور پر آپ کے ترجمے پر نظر ڈال لیتا ہوں۔ باقی
ہر چہ از دوست می رسد نیکو است۔ آپ اس معاملے میں کوئی تکلف و تردد
محسوس نہ فرمائیں۔ بلکہ مجھے الٹا یہ خدشہ ہے کہ آپ بربنائے مروت ایثار کر کے زیر بار نہ
ہوتے ہوں۔ اسلیے میری پرزور درخواست ہے کہ جب تک آپ کو ناشر سے
کچھ وصول نہ ہو مجھے کچھ عنایت نہ کریں اور اگر وصول ہو تو اس کا حصۂ غالب
اپنے گھر پر بس عشر عشیر ہی کا عطیہ میری جانب منتقل کریں
اگر وہاں سے یافت نہ ہو رہی ہو مگر یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصہ
والی صورت ہو تو مجھے دینے کی حاجت نہیں۔ ان شاء اللہ اس کام کا اجر آپکو
ساتھ مجھے بھی اللہ دے گا۔ والسلام علیکم

خاکسار

غلام علی

عکس جواب نامہ جناب ملک غلام علی صاحب بنام پروفیسر عبدالحمید صدّیقی

سوانحِ حیات و تاثرات

[illegible]

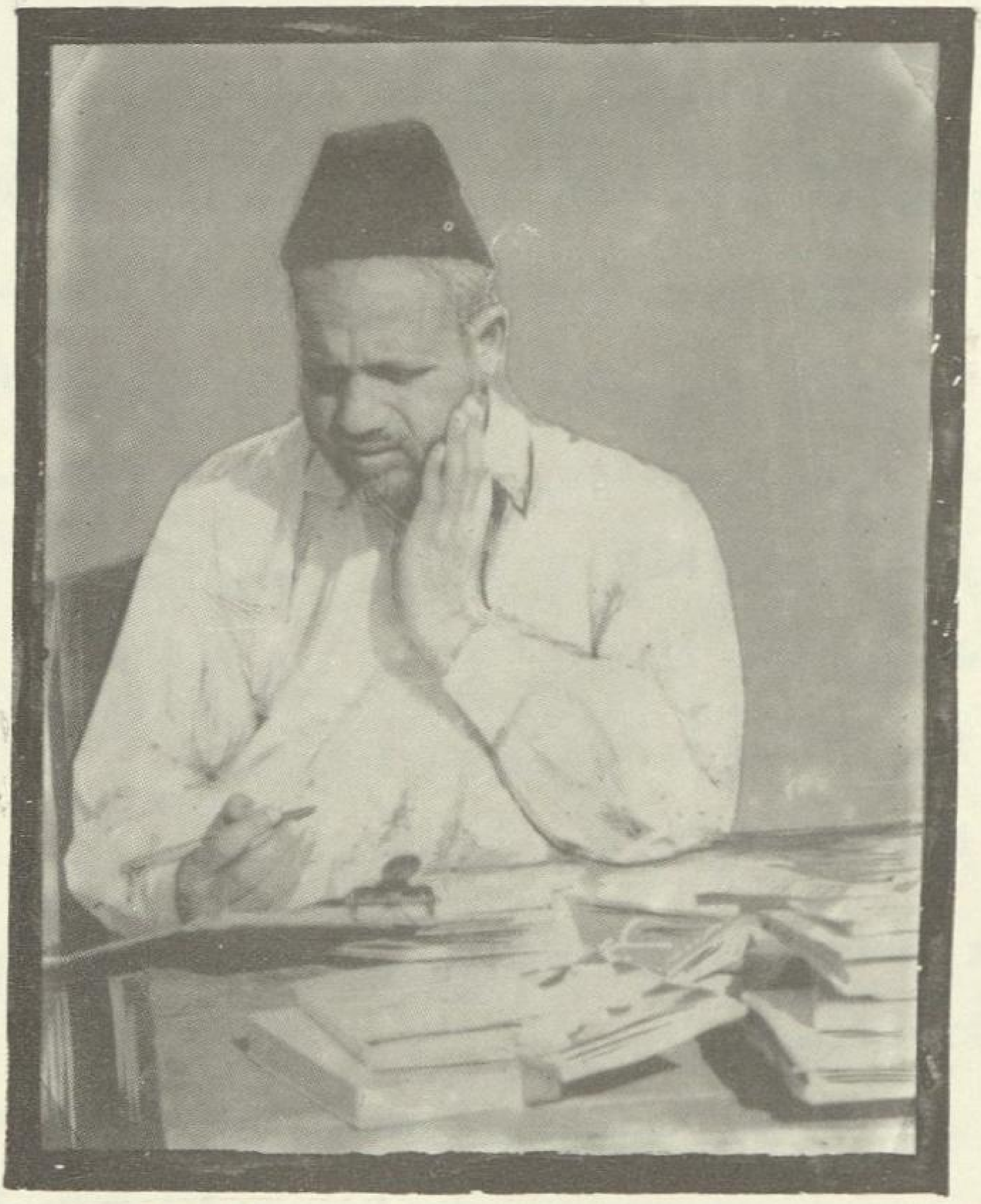
[illegible]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]



پروفیسر عبدُالحمید صدّیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فون نمبر : ۴۱۱۰۱۷

ابوالاعلیٰ مودودی

اے ذیلدار پارک - اچھرہ
لاہور - ۱۲ (پاکستان)

تاریخ 2891
حوالہ 18.1.78

ع۔ زہرہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے قابل قدر شوہر اور ہمارے محترم رفیق کے انتقال کی خبر سن کر مجھے نا قابل بیان صدمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہ میرے بہترین رفیقوں میں سے تھے۔ سالہاسال وہ ترجمان القرآن کےلیے مضامین لکھتے رہے۔ ان کی وجہ سے میں ایک طرح سے ترجمان القرآن کے بارے میں مطمئن ہوگیا تھا ۔ اس کے علاوہ انہوں نے اللہ تعالی کے دین کےلیے اتنا کا علمی کام کیا ہے کہ کم لوگ ہی ان کے برابر ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالی ان کو فردوس بریں میں جگہ دے ، آپ سب لوگوں کو صبر جمیل کی توفیق دے اور ان کے سب رفقاء کو بھی صبر عطا فرمائے ۔

جماعت اسلامی کے ارکان و متفقین کے علاوہ بکثرت دیندار لوگ ان کی بے حد قدر کرتے تھے اور ان سے دلی محبت رکھتے تھے ۔

شریک غم

ابوالاعلیٰ

عکس پیغامِ تعزیت جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

جناب عبدالحمید صدیقی نوراللہ مرقدہٗ کی وفات حسرت آیات پر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا پیغامِ تعزیت

۱۸ اپریل ۷۸ء کو وہ سانحہ پیش آیا جو پاکستان کے تمام اہلِ علم و اہلِ دین کے لیے، جماعت اسلامی کے رفقاء اور ہمدردوں کے لیے، قارئینِ ترجمان القرآن کے لیے اور ذاتی طور پر خود میرے لیے ایک عظیم صدمہ تھا۔ اُس روز اس مجسمۂ خیر انسان نے وفات پائی جو ایک سچے مسلمان کی زندگی کا نمونہ تھی۔ اُس روز اس خادمِ دین نے وفات پائی جس نے اپنی زندگی کے پورے ۳۵ سال اسلام کی خدمت میں بسر کر دیے۔ اُس روز وہ شخص دُنیا سے اُٹھ گیا جو دین و دُنیا کے علوم کا جامع تھا اور جس کے قلم سے اُردو اور انگریزی میں وہ تحریریں نکلیں جو انشاء اللہ رہتی دُنیا تک طالبینِ حق کو نفع پہنچاتی رہیں گی۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

میرے لیے مرحوم دست و بازو کا حکم رکھتے تھے۔ ۱۹۵۸ء کے آخری زمانے سے لے کر اپنے آخری مرض تک وہی "ترجمان" کے اشارات لکھتے رہے۔ اُنہوں نے اِس حد تک مجھے اس رسالے کے بار سے سبکدوش کر دیا کہ میں اپنی خرابی صحت کے طویل دَور میں تفہیم القرآن کو مکمل کر سکا۔ ورنہ بیک وقت دونوں کاموں کا بار اٹھانا میرے لیے مشکل تھا۔ اس طرح میں نے جو کچھ بھی تھوڑی بہت دین کی خدمت کی ہے۔ اس کے اجر میں بھی وہ میرے ساتھ شریک ہیں اور اپنی دینی خدمات کا اجر تو وہ پورا پورا خود ہی پائیں گے۔ اِنشاء اللہ۔

مَیں اللہ تعالےٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اُن کو اپنے صالح بندوں میں شامل کرے اور اُنہیں آخرت میں وہ اجر عطا فرمائے جو اس نے متقین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے مہیّا کر رکھا ہے۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن، مئی ۱۹۷۸ء)

آہ! عبدالحمید صدیقی مرحوم ومغفور

(یہ نظم آپ کے مرقد پر لکھی گئی)

ویران نظر آتا ہے گھر تیرے بغیر آج
مغموم ہے ہر فرد و بشر تیرے بغیر آج

ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہے مسلّط
بے نور ہوئے شمس و قمر تیرے بغیر آج

اے راحتِ جان دیکھ شبِ غم ہے ہماری
بیگانۂ انوارِ سحر تیرے بغیر آج

اُٹھ دیکھ ذرا گوشۂ تربت سے نکل کر
ہم ہو گئے سب تفتہ جگر تیرے بغیر آج

کیا بات ہے تُم کس لیے خاموش ہو بھائی؟
ہم لُٹ گئے تم نیند میں مدہوش ہو بھائی

تربت پہ تری بیٹھا ہوں دل مرثیہ خواں ہے
آنکھوں سے مری اشکوں کا اِک سیل رواں ہے

وہ جس کی بدولت کبھی رونق تھی دلوں میں
اب زیرِ زمیں منہمکِ خوابِ گراں ہے

یوں ہوتی ہے مرقد پہ تیرے نور کی بارش
معلوم یہ ہوتا ہے کہ جنّت کا سماں ہے

گھر چھوڑ کے جنگل میں کیا تو نے بسیرا
"معلوم ہے تجھ کو ترا شیدائی کہاں ہے؟"

وہ غمزدہ مہجور کھڑا دیکھ رہا ہے
لاچار ہے، مجبور کھڑا دیکھ رہا ہے

اے خاک تیری گود میں ہستی جو مکیں ہے
ارفع ہے ستاروں سے مگر خاک نشیں ہے

یوں دستِ اجل نے کیا پامال گلستاں
آلودۂ آلام شگوفوں کی جبیں ہے

احادیث کا شارح تھا، وہ قرآن کا مفسّر
وہ صاحبِ لولاکؐ کے ورثہ کا امیں ہے

جو رشد و ہدایت کا چراغ اس نے جلایا
روشن ہے مگر حیف! وہ موجود نہیں ہے

مرقد پہ تیری رحمتِ یزداں کی ہو بارش
بخشش کے لیے آپؐ کریں تیری سفارش

(رحمان شاد)

سوانح حیات وتذکارِ صدیقی نوراللہ مرقدہٗ

یہ مسلّمہ امر ہے کہ اس دارِ فانی میں ہر متنفس جلد یا بدیر موت کا ذائقہ چکھنے پر مجبور ہے اس لیے کوئی شخص دستِ اجل سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ بقول شاعر ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ ، کل ہماری باری ہے

یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو دُنیا سے جلد بُلا لیتا ہے لیکن موت کی آغوش میں سونے والوں کے مراتب جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ بعض لوگ جب اس مسافر خانہ سے رختِ سفر باندھتے ہیں تو ایک دل بھی ان پر گریہ وزاری نہیں کرتا۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی رحلت پر عزیز و اقربا، کا صرف محدود طبقہ نوحہ کناں ہوتا ہے لیکن بعض نامور ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی موت "موت العالِم موت العالَم" کے مصداق ہوتی ہے۔ اور ان کی رحلت سے کسی فردِ واحد یا چند ایک افراد کو ہی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اُن کی وفات پُوری قوم و ملّت کا نقصان ہوتا ہے۔

جناب عبدالحمید صدیقی نوراللہ مرقدہٗ ایسی ہی مقتدر شخصیات میں سے ایک تھے جنہیں اقوام سرمایۂ عزّ و افتخار سمجھتی ہوں اور احباب ان کے تعلق پر ناز کرتے ہوں۔ آپ فیض و عرفان کا ایسا چراغ تھے جس نے کئی سالوں تک ہزار ہا قلوب و اذہان کو منوّر کیا۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے گلستانِ علم اجڑ گیا۔ شدّتِ غم سے احباب کے چہروں کی رعنائیاں لُٹ گئیں۔ فرحت و انبساط نے ہچکیاں لے کر دم توڑ دیا اور دلوں کی بستیاں ویران ہوگئیں۔ آپ کا انتقال تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ اس سے ملّتِ اسلامیہ کی پوری عمارت

متزلزل ہو کر رہ گئی ہے۔

علم دیں فکر و عمل کے ترجماں کی موت ہے
آپ کی یہ موت گویا کل جہاں کی موت ہے

آپ کی وفات کی وجہ سے ہر مکتب فکر کے لوگوں کو صدمہ پہنچا۔ طلباء اس لیے سراسیمہ ہیں کہ ان کا مربّی اور مشفق نہ رہا۔ اہل و عیال اس تفکر میں غلطاں ہیں کہ ان کا ناخدا انہیں داغِ مفارقت دے گیا۔ احباب اس لیے غم سے نڈھال ہیں کہ وہ ایک مخلص دوست سے محروم ہو گئے۔ صوفیاء کو یہ صدمہ ہے کہ سوز و گداز کا مجسّمہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عوام اس لیے متاسف ہیں کہ ان کا سپہ سالار ان سے منہ موڑ گیا۔ جدید طبقہ کو یہ پریشانی ہے کہ مسائل حاضرہ کا اسلامی حل پیش کرنے والا اللہ کے حضور پہنچ گیا۔ نادار مبہوت ہیں کہ ان کی ڈھال ٹوٹ گئی۔

حسب و نسب

گوجرانوالہ سے مشرق کی جانب تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ایک بارونق گاؤں فیروزوالہ واقع ہے۔ اس سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس پر ایک ایسا خاندان آباد ہے جس نے ہر دَور میں نجابت اور شرافت کی درخشاں روایات کو برقرار رکھّا اور دین کی سربلندی کے لیے ہمیشہ گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ یہ خاندان علم و عرفان اور رشد و ہدایت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے لاکھوں تشنگانِ تعلیم سیراب ہو چکے ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ معاشرہ میں اس خاندان کے افراد کو علم و فضل کے باعث اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے اور ہر شخص انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جناب عبدالحمید صدیقیؒ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ ۲۱ رمئی ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے حسنِ عمل اور علمی کارناموں کی بدولت اپنے خاندان کے وقار کو چار چاند لگائے اور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام جناب محمد علی نوراللہ مرقدہٗ تھا، والدہ ایک عابدہ اور پارسا عورت ہیں جو ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔ یہ نیک والدین کی تربیت

اور مخلصانہ دعاؤں کا ثمرہ تھا کہ ذرّہ خاک کو آفتاب جیسی تابانی حاصل ہوئی اور اس نے دُور دُور تک علم و عرفان کی شعاعوں سے اجالا کر دیا۔ ہمارے والدِ مرحوم تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کے پیکر تھے عفیف و پارسا تھے۔ عجز و انکساری کا نمونہ تھے اور حسنِ خلق کی جیتی جاگتی تصویر تھے ان کے سایۂ عاطفت میں پرورش پا کر جناب صدیقی مرحوم میں بھی اسی قسم کی صفات پیدا ہو گئیں۔ ہمارے والد جناب محمد علی محکمہ ریلوے میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، مزید وہ ایک مُستند اور ماہر طبیب بھی تھے۔ آپ کے دستِ شفا سے بیشمار لوگ صحت یاب ہوئے۔ دور دراز تک آپ کی طبابت کا شہرہ تھا، لیکن آپ نے اس فن کو کبھی ذریعہ معاش نہ بنایا بلکہ اسے انسانیت کی خدمت اور دین کی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔ آپ مریضوں کا بلا معاوضہ علاج کرتے۔ قرآن اور نماز پڑھنے کی تلقین فرماتے اور اُن کی روحانی اور جسمانی صحت کے لیے دُعا کرتے یہی اُن کا معاوضہ اور حاصل تھا۔ آپ کے اس طریقِ علاج اور حسنِ سلوک سے بے شمار لوگ صحت یاب ہو کر نیک اور پارسا بن جاتے اور اس طرح ان کی زندگی کی کایا پلٹ جاتی۔ دراصل ہمارے والدان مقربین بارگاہِ رب العزّت میں سے ایک تھے جنہیں دیکھ کر خدا یاد آتا اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

ان کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا　　　نورِ رُخ اُن کا چراغِ راہِ عرفان ہو گیا

عہدِ طفولیت سے عالم شباب تک

جناب عبدالحمید صدیقی کی پیدائش کے بعد ہمارے والد مرحوم ملازمت کے سلسلہ میں ترکِ سکونت کر کے راولپنڈی چلے گئے۔ شاید قدرت کا یہ منشا تھا کہ اس ہونہار بچّہ کو حصولِ تعلیم و تربیت کے لیے بہترین مواقع میسّر آسکیں اور اس کی خُفتہ لیکن خداداد صلاحیتیں پوری طرح اُجاگر ہو سکیں۔ آپ نے ابتدائی دینی تعلیم امام العصر مولانا غلام اللہ خاں صاحب سے حاصل کی۔ چونکہ قدرت نے آپ کو اعلیٰ دماغ تفویض کیا تھا، اس لیے آپ نے جلد ہی قرآن پاک کے علوم میں خاصی دسترس حاصل کر لی۔ ایسے قابل مخلص۔ زاہد اور

پارسا استاد کے سایۂ شفقت میں رہ کر آپ کا دل خدا کی جلوہ گاہ بن گیا۔ تعلق مع اللہ اور نورِ ایمان نے آپ کے قلب و نظر کو روشن کر دیا۔ چونکہ استاد صاحب صفا تھے اس لیے اُنہوں نے آپ کے دل و دماغ پر پارسائی اور تقویٰ کے انمٹ نقوش ثبت کر دیے۔

صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پُرنور ہے لالۂ لبِ آبجو

آپ بچپن کے زمانہ میں بھی پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے۔ کھیل کُود سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ بُرے افعال سے گریز کرتے اور نیکی کے کاموں میں ذوق و شوق سے حصّہ لیتے۔ آپ ہمیشہ شریف لڑکوں کی صحبت اختیار کرتے۔ دنیوی تعلیم کے حصول کے لیے آپ اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی میں داخل ہُوئے اور وہیں سے میٹرک کا امتحان نمایاں حیثیت سے پاس کیا۔ بعدازاں ڈی۔اے۔وی کالج راولپنڈی میں داخل ہُوئے اور چار سال کے بعد بی اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کا طرزِ عمل قابلِ ستائش تھا۔ آپ شب و روز مطالعہ میں منہمک رہتے اور اپنے قیمتی وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنے سے اجتناب کرتے۔ اساتذہ کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے اور ان کی خدمت کرنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔ اُن کے اس روّیہ کی وجہ سے اساتذہ بھی ان سے بے انتہا شفقت سے پیش آتے۔ استاد اور شاگرد کے اسی مضبوط اور گہرے رشتے کی بدولت اُنہوں نے تمام تعلیمی مدارج احسن طریقہ سے طے کر لیے۔ آپ صرف اپنے ہم ذہن اور اسلامی نظریات کے حامل طلباء سے ہی دوستانہ تعلقات استوار کرتے اور ان کی دامے، درمے، سخنے امداد فرماتے۔ ہمارے والد مرحوم نہایت دور اندیش اور علم دوست انسان تھے۔ اُنہوں نے ہمیشہ ہماری تعلیم اور تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ چونکہ جناب عبدالحمید صدیقیؒ ان کے سب سے بڑے بیٹے اور ہمارے سب سے بڑے بھائی تھے، اس لیے آپ تمام اہلِ خاندان اور والدین کی محبّت کا مرکز تھے۔ ناز و نعم کے ماحول میں پروان چڑھنے والے اس مایۂ ناز فرزند پر تقدیر مسکرا رہی تھی۔

شاید اس لیے کہ اس کی جانب آلام و مصائب کے گھنیرے سائے بڑھتے آرہے تھے، لیکن اسے احساس تک نہیں تھا۔ آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ والد مرحوم بیمار پڑ گئے اور طویل رخصت لے کر اپنے آبائی گاؤں فیروز والہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ برادرِ محترم نے دوران علالت ان کی بہت خدمت کی، لیکن وہ صحت یاب نہ ہو سکے اور ہمیں شفقتِ پدری سے محروم کر کے ملکِ عدم کو سدھار گئے۔ اب خاندان کی کشتی گرداب میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ ناخدا تو موجود تھا، لیکن تجربہ کار نہیں تھا۔ قدرت نے آپ کی راہنمائی کی اور آپ نے نامساعد حالات کے باوجود اس ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا عزم کیا۔ اس وقت ہمارا خاندان تقریباً دس افراد پر مشتمل تھا اور ہمارا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں تھا۔ برادرِ محترم نے خاندان کی کفالت کا بارِ گراں اپنے ناتواں اور ناتجربہ کار کندھوں پر اُٹھا لیا۔ آپ نے ہماری تعلیم اور تربیت کے بارے میں کبھی تغافل نہیں کیا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی ہمیں حوادثِ زمانہ سے محفوظ رکھا۔ ہمیں زندگی کی تاریک راہوں سے بچانے کے لیے آپ نے آندھیوں کی زَد پر بھی چراغ جلائے۔ بہر حال وقت گزرتا گیا اور دل کے زخم مندمل ہوتے گئے۔

کامیاب معلّم

والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد ہمارا خاندان شدید مشکلات سے دوچار ہو گیا۔ ان مصائب پر قابو پانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ لیکن جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور نے آہنی عزم کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔ اس وقت کالج میں داخل ہو کر زیادہ دیر تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا آپ کے لیے ناممکن تھا، اس لیے آپ نے بی۔ٹی کی پیشہ ورانہ سند حاصل کرنے پر اکتفا کیا تاکہ تدریسی پیشہ اختیار کیا جا سکے۔ مصلحت یہ تھی کہ یہ کورس قلیل عرصہ میں کیا جا سکے گا۔ مزید امتحانات پرائیویٹ

طور پر پاس کیے جا سکیں گے اور چھوٹے بھائیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے بہترین مواقع میسر آسکیں گے۔ آپ نے بی۔ٹی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں بطور سینیئر انگلش ٹیچر ملازمت اختیار کر لی۔ آپ ذوق و شوق، نیک نیتی، محنت اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ آپ اپنے تلامذہ کو زائد وقت میں بلا معاوضہ پڑھایا کرتے تھے۔ یہ آپ کا ایثار تھا جسے طلباء نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ کا طریقِ تعلیم اس قدر مؤثر تھا کہ جو کچھ بھی آپ پڑھاتے اسی وقت شاگردوں کو ازبر یاد ہو جاتا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ اپنے شاگردوں کو جب بھی موقع ملتا اسلامی اقدار سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے تاکہ وہ صراطِ مستقیم پر چل سکیں اور ضلالت کے گڑھوں سے بچ سکیں۔ ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے شاگرد احکم الحاکمین کے اطاعت شعار بندے بن کر خلیفۃ اللہ کے منصب پر سرفراز ہوں۔

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم کا طلباء کی اصلاح کا طریقِ کار منفرد اور جداگانہ تھا۔ اگر وہ طالب علم کی کسی حرکت پر ناراض ہوتے تو اسے بدنی سزا دینے کے بجائے اس پر سے اپنی توجہ ہٹا لیتے۔ طالب علم کو آپ کی یہ بے اعتنائی بڑی شاق گزرتی اور وہ معافی مانگ کر تائب ہو جاتا۔

میں نے متعدد بار اس تجربہ کا مشاہدہ کیا ہے کہ آپ جیسے مہربان اُستاد کی شفقت سے محروم ہونے والا طالب علم اشکبار آنکھوں سے برادرِ محترم کے سامنے اپنی غلطی پر اظہارِ تاسف کرتا اور معافی کا طلبگار ہوتا۔ آپ ایک شفیق باپ کی طرح اسے معاف کر دیتے اور بعض اوقات اسے گلے سے لگا لیتے۔ اس طرح اس طالب علم کی اصلاح ہو جاتی اور وہ آئندہ اس غلطی کا کبھی ارتکاب نہ کرتا۔ خوش قسمتی سے مجھے جناب عبدالحمید صدیقیؒ کا شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ آپ طلباء کو بدنی سزا دینے سے ہمیشہ اجتناب کیا کرتے تھے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

"وہ اُستاد جو دورانِ تدریس بدنی سزا دیتا ہے، درحقیقت شکست خوردہ ذہنیت کا مالک ہوتا ہے۔ سزا دہندہ بچے کی قوتِ اختراع کو دبا دیتا ہے اور اس کی نشوونما کو منجمد کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح بچے کٹھ پتلی تو بن جاتے ہیں لیکن عظیم انسان نہیں بن سکتے۔ بدنی سزا کے نتائج ہمیشہ منفی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کی وجہ سے معلّم اور متعلّم کے درمیان اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے اور ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔"

تلامذہ سے حسنِ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ برادرِ محترم کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ آپ کے ہر حکم کے سامنے بلاحیل و حجت سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔ جب کبھی بھی برادرِ محترم کی رفاقت میں بازار سے گزرتا یا کسی ادارہ میں جاتا تو مرحوم کی عزت اور احترام کے حیرت انگیز مناظر دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ سعادتمند شاگرد آپ کو دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور بڑے تپاک سے آپ سے ملاقات کرتے۔ یہ آپ کے حسنِ اخلاق کا ردِّ عمل تھا کہ تلامذہ کو آپ سے عشق تھا۔ بعض دفعہ تو عقیدت سے آپ کے ہاتھوں کا بوسہ لینا اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ مَیں بذاتِ خود عرصہ دراز سے تدریسی پیشہ سے منسلک ہوں لیکن بلا مبالغہ مَیں نے آج تک کوئی ایسا استاد نہیں دیکھا جسے آپ کی طرح اعزاز و تکریم حاصل ہو۔ برادرِ محترم پر جب پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا تو عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک دن ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی چارپائی کے نزدیک زمین پر بیٹھ گیا اور زار و قطار روتے ہوئے آپ کے پاؤں دبانے لگا۔ ہم نے بمشکل اسے کرسی پر بٹھایا اور برادرِ محترم نے اس کی دلجوئی کی۔ اس شخص کے اس طرزِ عمل نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلا گیا تو آپ نے فرمایا:

"شادؔ! یہ لڑکا کسی زمانہ میں بیحد غریب تھا۔ مَیں بے پایاں شفقت سے اس

کے ساتھ پیش آیا۔ میں نے اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کیے اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اس نے سخت محنت کی اور کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ آج کل اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے۔ وہ مجھے "باپ" کہتا ہے اور میں اسے اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہوں"۔

برادرِ محترم کے ان الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں سوچنے لگا کہ اس دَور میں ایسے شفیق اساتذہ کہاں ملتے ہیں؟ آج استاد اور شاگرد کا رشتہ کاروباری صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کا طبقہ احترام کی دولت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

برادرِ محترم جب سکول میں بطور معلّم خدمات سرانجام دے رہے تھے تو آپ نے ایم۔ اے (اقتصادیات) کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا۔ چونکہ آپکی حُسنِ کارکردگی کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ اس لیے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں جلد ہی آپ کی تقرری بطور لیکچرار ہو گئی۔

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور نہایت رقیق القلب اور حلیم الطبع انسان تھے، کسی کو افسردہ خاطر دیکھتے تو آنکھوں سے آنسوؤں کے پیمانے چھلک پڑتے، لیکن آپ دین کے خلاف ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ شرفاء اور غرباء کے ساتھ تواضع اور انکساری سے پیش آتے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ مرید ہیں اور ملاقاتی شیخ طریقت ہے لیکن برادرِ محترم قدس سرہٗ اہلِ زیغ و زنادقہ کے لیے تیغِ بے نیام کی مانند تھے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حق گوئی آپ کا شیوہ تھا۔ آپ حق کے معاملہ میں مصلحت بینی کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جب آپ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں بحیثیت پروفیسر خدمات سرانجام دے رہے تھے تو کالج کے پرنسپل نے ایک مرتبہ سٹاف میٹنگ میں عملہ کے کسی معزز رُکن کے خلاف لب کشائی کرتے ہُوئے داڑھی کو نشانۂ تضحیک بنایا۔ برادر محترم نے پرنسپل صاحب کے اس رویّہ کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور اس سُنّتِ رسولؐ کی توہین کرنے والے شخص کے ماتحت کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جب طلباء کو اس افسوسناک واقعہ کا عِلم ہوا تو اُنہوں نے ہڑتال کر دی اور جلوس نکالا۔ شمعِ علم کے پروانے آپ پر زندگیاں نثار کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ نے طلباء کو پُرسکون رہنے کی تلقین کی کیونکہ آپ کو ہنگامہ آرائی سے طبعاً نفرت تھی۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے کا خدشہ لاحق ہوا تو پرنسپل صاحب نے آپ سے رابطہ قائم کیا اور اپنے طرزِ عمل پر ندامت کا اظہار کیا اور بار بار معذرت چاہی لیکن آپ اپنے مؤقف پر ثابت قدم رہے اور مُلازمت سے سبکدوش ہونے پر مصر رہے۔ احباب نے آپ کو استعفےٰ واپس لینے پر بے حد مجبور کیا۔ لیکن ان کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور جب وہ مایوس ہو گئے تو ایک صاحب نے کہا:

"عجیب آدمی ہے' اعلیٰ ملازمت کو ٹھکرا رہا ہے۔ بیروزگاری کے اس دَور میں حصُولِ مُلازمت نہایت مشکل کام ہے۔ کس طرح گزر اوقات ہو گی۔"

لیکن اس انجان کو کیا معلوم تھا کہ ٹھکرانے والا کون ہے؟ وہ بظاہر مردِ درویش تھا لیکن خدا پر توکّل اور قناعت کے بیش بہا خزانے کا مالک تھا۔ وہ ایک ایسا پُرعزم اور بلند حوصلہ انسان تھا جسے اپنے اللہ کے خالق اور رازق ہونے پر غیر متزلزل یقین تھا۔ اگر اسے جاہ و منصب کی خواہش ہوتی تو اعلےٰ ترین عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا، لیکن اس نے ہر پیشکش کو گدایانہ خودداری سے مُسترد کر دیا۔

علم وفضل اور فہم وفراست میں آپ کی برتری ہر طبقہ پر مسلّم تھی۔ حق تعالیٰ سے رشتۂ قلب اس قدر قوی تھا کہ آسمان سے رحمتِ الٰہی کھینچ لاتا۔ آپ ہر کام کرنے سے پہلے اتنی دُعائیں مانگتے اور نالہ ہائے نیم شبی میں اس قدر سسکیاں بھرتے کہ خدائے رؤف الرحیم کو آپ پر ترس آجاتا تھا اور وہ اپنی رحمت کے دروازے آپ کے لیے واکر دیتا تھا۔ ملازمت کا ایک در بند ہونے کے بعد آپ کے لیے سینکڑوں دَروازے کھل گئے اور حصولِ معاش کے کئی اسباب پیدا ہو گئے۔ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ سے فارغ ہونے کے بعد فوراً آپ کو اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت مل گئی، لیکن ایوب خاں کے دورِ استبداد میں آپ نے اس ملازمت پر جماعتِ اسلامی کی خدمات کو ترجیح دی۔ ۱۹۵۸ء میں "ترجمان القرآن" کی ادارت سنبھال لی۔

سیّد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے فیضانِ نظر سے آپ جلد ہی بے باک صحافت سے دل کی دھڑکن بن گئے اور تحریر کے ذریعہ اپنی آتشِ دروں سے قارئین کے دلوں کو گرمانے لگے۔ آپ نڈر اور حق گو صحافی تھے۔ بعض اوقات آپ کی بے باک تحریریں دیکھ کر دل کانپ اُٹھتا کہ خدانخواستہ آپ جبر و استبداد کے شکنجہ کی گرفت میں نہ آجائیں۔ ایک مرتبہ میں نے اس اندیشہ کے پیشِ نظر عرض کیا: "بھائی جان! "اشارات" میں آپ حکومت پر اس قدر جرأت مندانہ اور بے لاگ تنقید کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو آپ اقتدارِ اعلیٰ کے زیرِ عتاب آجائیں۔"

جواب میں آپ نے فرمایا: "ایک مسلمان صحافی ہونے کی حیثیت سے باطل قوتوں کے خلاف کلمۂ حق کا اعلان میرا فرض ہے۔ جس کے لیے میں آخرت میں جواب دِہ ہوں، اس لیے مجھے دنیاوی نتائج کی قطعاً کوئی پروا نہیں۔ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کے حضور سُرخرو ہونا چاہتا ہوں۔"

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خاں کے ادوارِ حکومت میں آپ کے تحریر کردہ "اشارات" حکومت کے ایوانوں میں ہیجان پیدا کرتے رہے۔ آپ ہر اس تحریک کی بیخ کنی ضروری خیال کرتے تھے، جس سے اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ آپ نے ہر دَور میں حکومت کو انتباہ کیا کہ غیر اسلامی نظام پاکستانی عوام کے مزاج کے خلاف ہے، اس لیے وہ اسلامی قوانین اور شرعی مسائل کو سیاست کی جولانگاہ نہ بنائیں۔ خواہ عائلی قوانین ہوں یا اہلِ قرآن کے نام سے نشوونما پانے والا الحادی گروہ ہو آپ نے ہر ایک کا مقابلہ کیا اور دلائل کی قوّت سے ان کی ریشہ دوانیوں کو پُوری طرح آشکار کیا۔ اس سلسلہ میں آپ کے رشحاتِ قلم کی معمولی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے:

"ملک غلام محمد کے عہدِ اقتدار میں جب مُلک کی سیاسی زندگی زیروزَبر ہوئی اور اسے عوامی حمایت کھو کر ایک خاص طبقے کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو اس کے ارد گرد چند ایسے دانشور جمع ہو گئے جو اگرچہ کافر تو نہ تھے مگر دِلدادہ فرنگ ہونے کی وجہ سے اسلام سے دُور مغرب کے کافرانہ نظامِ زندگی کے قریب تر تھے۔ ان فرنگیت مآب اور حکومت میں دخیل اہلِ ہنر کی سرپرستی میں کفر کو آگے بڑھنے کے بڑے مواقع فراہم ہُوئے۔ اُنہوں نے ثقافت کے نام پر فسق و فجور کو خوب پھیلایا اور اس طرح مُلحدانہ افکار و نظریات مُسلم معاشرے میں جڑ پکڑنے لگے۔ ایمان اور پاکبازی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح الحاد اور فسق و فجور میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس دل میں ایمان کی حرارت ہو گی وہ لازمی طور پر نیکی کی طرف ہی راغب ہو گا اور جو شخص فسق و فجور میں مبتلا ہو گا، اسے کُفر ہی راس آئے گا۔ جس معاشرے میں بے حیائی پھیلتی ہے۔ اس میں ضبطِ نفس کے بندھن ٹوٹتے ہیں۔ حق و باطل کا امتیاز مٹتا ہے اور کُفر اسے تر نوالہ سمجھ کر بڑی آسانی کے ساتھ نِگل جاتا ہے۔

سکندر مرزا کے دَورِ حکومت میں بھی ملک کے اندر فحاشی کا دائرہ مسلسل پھیلتا رہا۔ اور کُفر و الحاد کو معاشرے کے مختلف طبقوں خصوصاً اُونچے طبقے یا حرام خور مُلازمین کے

اندر نفوذ کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ یہ شخص اپنی روایتی نا اہلی اور سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے نوکر شاہی کے ہاتھوں میں محض کٹھ پُتلی تھا۔ خاص طور پر وہ سرکاری عُہدے دار جو اس کے ساتھ براہِ راست وابستہ تھے۔ وہ اس سے جو کام چاہتے بآسانی لے لیتے۔

اسلامی اقدار ان کے احترام اور ان کی پابندی کے لحاظ سے مُسلم معاشرے کی صورتِ حال مسلسل بگڑتی رہی۔ سیاسی اور معاشی خلفشار اور مُلک کے نظامِ تعلیم میں کربناک انتشار اور نظم و نسق میں خوفناک ابتری نے تخریب پسند قوتوں کی پُوری طرح حوصلہ افزائی کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ۱۹۴۷ء میں دین سے بغاوت کے جو رجحانات ایک نہایت ہی محدود سے طبقے میں نظر آتے تھے اور جن کی وجہ سے یہ طبقہ اپنے آپ کو اُمّت سے بے تعلق سا محسوس کرتا تھا، وہ معاشرے کے دُوسرے طبقوں میں بھی پھیلنے لگے۔ اس وقت اس امر کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ اِن باطل افکار سے کتنے فیصد لوگوں نے کس حد تک اثر قبول کیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مُسلمانوں کے دِلوں میں کفر و الحاد کے خلاف جو شدید نفرت تھی اس کی شدّت کسی حد تک کم ہو گئی اور وہ مُلحد طبقوں سے جو بُعد و بیگانگی محسوس کرتے تھے وہ غیر شعوری طور پر مداہنت میں تبدیل ہونے لگی۔

ملک غلام محمد اور سکندر مرزا کے دَورِ اقتدار میں اس مُلک کے اندر دینِ حق کو جو نقصان پہنچا، تاریخ کا کوئی طالبِ علم اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ دونوں فرمانروا اکبر کی طرح دین کا کوئی ایسا تصوّر نہ رکھتے تھے جسے وہ پاکستان میں حکومت کی قوتِ نافذہ کے ذریعے عوام پر مسلّط کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دین کے بارے میں اپنے کوئی خاص عزائم بھی نہ رکھتے تھے جن کی تکمیل کے لیے انہیں اقتدار کی ضرورت لاحق ہو۔ اُن کی سیرت و کردار اور اُن کی انفرادی، اجتماعی سرگرمیوں اور محلّاتی سازشوں کو دیکھ کر اس اَمر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نشۂ اقتدار کی خاطر مسندِ اقتدار سے طویل عرصہ کے لیے چمٹا رہنا چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں اقتدار سے کوئی دلچسپی

نہ تھی۔ ہمارے ملک میں جو حکمران ایک بگڑے ہوئے مُغل فرمانروا کی طرح دین کے بارے میں اپنے مخصوص تصوّرات اور اجتماعی زندگی کا مخصوص نقشہ ذہن میں رکھ کر تختِ اقتدار پر قابض ہوا، وہ محمد ایّوب خان تھا۔ جن لوگوں نے اس کی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس کے دینی رجحانات، اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس کے ذاتی خیالات اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کے متعلق اس کے ارادوں سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اسلام کا دشمن تو نہ تھا، لیکن اسلامی تعلیمات کے اندر ایسی تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا جن سے پاکستان میں دین کا نام تو رہے لیکن جو اجتماعی نظام قائم ہو، وہ اس ملک کو کمال اتاترک کا ترکی بنا دے۔ چنانچہ اس شخص نے اسلامی نظام کی اساس منہدم کرنے کی غرض سے سُنّتِ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم پر بڑے عامیانہ انداز میں حملے کیے۔ اس کا ایک خطبۂ صدارت، جو اُس نے اُونچے فوجی افسروں کے ایک خاص اجتماع میں دیا۔ وہ اس کے اصل عزائم کو پُوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ اس میں سُنّت کی آئینی حیثیت پر بحث کرتے ہُوئے پہلے تو راویوں اور اندازِ روایت کا مذاق اڑاتا ہے، پھر تمسخر کے انداز میں کہتا ہے جب اکبر اور جہانگیر کے حالات صحت کے ساتھ قلمبند نہیں کیے جا سکتے جو نسبتاً قریب کے دَور کے حکمران ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے کے کسی شخص کے سوانح من وعن احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہوں۔ اس ضمن میں فیلڈ مارشل صاحب نے عربوں پر ایک الزام یہ بھی عاید کیا کہ لوگوں کی قوتِ متخیلہ بہت تیز ہے، اس لیے بہت کُچھ زیبِ داستاں کے لیے بڑھا لیتے ہیں۔ پھر اس شخص نے اس کتابچہ میں وقت کے تقاضوں کا بھی بڑے شدومد کے ساتھ ذکر کیا اور مذہب کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی کی کہ مذہب انسان کے لیے ہے نہ کہ انسان مذہب کے لیے۔ اس لیے مذہب کو انسان اور اس کی ضروریات کے تابع رہنا چاہیے۔"

(ماہنامہ "ترجمان القرآن"، اکتوبر ۱۹۷۷ء)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان فوجی آمر تھا۔ وہ ملک میں قسطائی نظام رائج کرنے

کا خواہاں تھا۔ جناب عبدالحمید مرحوم نے اس کے اِن عزائم کا پردہ چاک کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے فوجی انقلاب کے ذریعہ اس ملک میں فسطائی نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور جب فوج نے اس خطۂ پاک پر اچانک قبضہ کیا تو ملک کی پوری آبادی مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس پر کیا بیتی ہے اور فوج کا وہ سربراہ جسے اس ملک کے عوام نے دفاعِ وطن کا مقدس فرض سونپ رکھا تھا۔ اس نے کیونکر ان کی آزادی سلب کر لی۔ دو تین سال تک ان پر سکتے کا عالم طاری رہا اور وہ خاموشی سے ان ساری چالوں کو دیکھتے رہے جو ان کے ذہنوں کو مفلوج کرنے اور آزادی کے احساس سے محروم کرنے کے لیے چلی جا رہی تھیں۔ لیکن چونکہ اُنہوں نے اپنے مستقبل سے یکسر مایوس ہو کر خود اپنی مرضی سے غلامی کا طوق پہنا تھا، اس لیے جلد ہی ان کے دلوں میں فیلڈ مارشل صاحب کے آمرانہ عزائم کے خلاف ردِّ عمل شروع ہُوا جس نے بڑھتے بڑھتے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور وہ عوام کو ان کے چھینے ہُوئے حقوق دینے پر آمادہ ہو گئے، مگر فاشزم کے علمبرداروں کو اصلاحِ حال کی یہ صورت کب گوارا تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ملک جمہوریت کی راہ پر آتے آتے پھر فسطائیت کی راہ پر چل نکلا۔

یحییٰ خاں نے حالات کو بہتر بنانے کی قطعاً کوشش نہ کی بلکہ بگڑتے ہوئے حالات کو سُرعت کے ساتھ بگاڑنے کا التزام کیا۔ اس کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہُوئے یہ بات صاف دکھائی دیتی تھی کہ وہ ملک کی تعمیر کا خواہاں نہیں بلکہ اس کی تخریب کے درپے ہے اور اس کے باشندوں کو خلفشار کے ذریعے پوری طرح مفلوج کر دینا چاہتا ہے۔

فوجی آمریت کے ذریعے فسطائیت کا تسلّط بھی اگرچہ کسی قوم کے لیے کم اذیّت ناک تجربہ نہیں ہوتا مگر جو فسطائیت، خلفشار، دہشت پسندی، دھونس دھاندلی، عدم تحفظ کے شدید احساس اور معاشی انصاف کے پردے میں معاشی استحصال اور ناانصافی کے جلو میں آتی ہے وہ نتائج کے لحاظ سے انتہائی تباہ کن ہوتی ہے کیونکہ اس میں پہلے آزادی کے احساسات کو مُردہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کے مدفن پر فسطائیت کا محل تعمیر ہوتا ہے اس لیے اس کے علمبردار عوامی جذبات سے یکسر بے پروا ہو کر انسانوں کو جس طرح چاہتے ہیں، استبداد کی چکی میں پیستے ہیں اور انہیں کسی قسم کا کوئی کھٹکا محسوس نہیں ہوتا، کیونکہ عوام کے اندر ظلم کے خلاف احتجاج کی قوّت تو کجا ان کے اندر آہ بھرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔

ہمارے ملک کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ قوم جس پر تیرہ برس تک فوجی آمریت کے ذریعے فسطائیت مسلّط کرنے کے پیہم تجربات کیے جاتے رہے ہیں۔ اس میں اب خلفشار اور تشدّد کے ذریعے اس ظالمانہ نظام کو رواج دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ وہ قوم جو عرصہ دراز تک فوجی آمریت کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بن چکی ہے۔ اسے اب عوامی حکومت، عوامی مفاد کے نام پر استبداد کی بھٹی میں جھونک رہی ہے تاکہ اس کی انسانیت جُھلس کر رہ جائے۔ اور اس کی آرزوئیں اور تمنائیں جل کر خاکستر ہو جائیں اور اس کے اندر کبھی بھی یہ احساس زندہ نہ ہونے پائے کہ وہ ذی روح انسانوں کا گروہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کی خلعت عطا کر کے اس دُنیا میں اُتارا ہے۔ اس لیے وہ بندوں کی غلامی کے لیے نہیں بلکہ خُدا کی غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہے اور جو فرد یا گروہ اجتماعی مفاد کے نام پر اس کے انسانی حقوق سلب کرتا ہے وہ اس کا

بہی خواہ نہیں، بلکہ اس کا دشمن ہے۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۲ء)

جب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ملحدانہ چیرہ دستیوں نے صدر ایوب کی سرپرستی میں بڑھتے بڑھتے تحریفِ دین کی صورت اختیار کر لی تو آپ اسلام کا جدید ایڈیشن تیار کرنے والوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب ضبط ہونے کے بارے میں آپ کی نگارشات ملاحظہ فرمایئے:

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب "اسلام" پر پورے ملک میں جو اضطراب پیدا ہوا، اس کی وجہ سے صدرِ مملکت اور اُن کی حکومت ناواقف نہیں۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اسلامی عقائد سے ہم آہنگ نہیں؛ چنانچہ ان کی حکومت نے اچھا کیا کہ اس شخص سے گلو خلاصی حاصل کی اور عوام کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو ایک حد تک بروقت فرو کر دیا، مگر اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں فطری طور پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہاں مسندِ اقتدار پر غیر مسلم متمکن ہوتے تو مسلم عوام کو دینی معاملات میں یہی روش اختیار کرنا چاہیے تھی۔ یعنی جب کوئی خلافِ دین بات ان کے سامنے آتی تو وہ علانیہ طور پر غم و غصہ کا اظہار کرتے اور حکومت کو بتاتے کہ فلاں فلاں معاملے میں اُن کے مذہبی احساس کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اس لیے اس کے تدارک کی فکر کی جائے، لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں خدا کے فضل سے زمامِ کاران لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، جنہیں اسلام سے محبت اور عقیدت ہے۔ اسلام کے ساتھ وابستگی کے ہوتے ہوئے کسی فتنے کے تدارک کے لیے عوام کی طرف سے اس قدر شدید تقاضے کا منتظر رہنا یا اس تک نوبت پہنچنے دینا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ شاید صدرِ مملکت کو اس فتنے کا علم ہی نہ ہو، مگر یہ بات بھی قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ جس مقتدر شخصیت کا نظام جاسوسی و سراغرسانی اتنا مضبوط ہے کہ وہ ہر اُس فرد یا گروہ پر کڑی نگاہ رکھتا ہے جو صدرِ محترم سے ذرا اختلاف کی جرأت بھی کرے اور اس کی بنیاد پر اس کی حکومت ایسے افراد اور گروہوں پر عتاب بھی نازل کرتی رہتی ہے! اور انہیں راہِ راست پر لانے یا بے اثر بنانے کے لیے بڑے مؤثر اقدام بھی کرتی ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ اسے دین کے خلاف فتنوں کا صحیح صحیح علم نہیں ہونے پاتا بالکل ناقابلِ یقین ہے۔ صدرِ مملکت نے اپنی انتظامی مشینری کو جس سانچے میں ڈھالا ہے اس کی استعدادِ کار میں کسی اور پہلو سے اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر اس پہلو سے ضرور اضافہ ہوا ہے کہ جو لوگ ذرا بھی اُن سے مختلف انداز سے سوچتے ہیں، اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے یا کم از کم اُنہیں مُلک کے اجتماعی معاملات میں بالکل بے اثر بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس مستعد مشینری کے ہوتے ہُوئے یہ قیاس کرنا کہ انہیں شاید ان فتنوں کی اطلاع نہیں ہوتی ناقابلِ فہم ہے۔

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب جن افکار و خیالات کے علمبردار ہیں وہ کوئی ایسے خیالات نہیں جو دفعتاً صدرِ مملکت کے سامنے آئے ہوں۔ وہ اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس اسوۂ رسولؐ سے انہیں محبّت ہے۔ اس اسوہ کے خلاف یہاں ایک گروہ باقاعدہ سازش کر رہا ہے، اور جس اُسوہ کی اتباع کو وہ اپنے لیے اور نوعِ انسانی کے لیے فلاح کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔ اسکے بارے میں یہاں گزشتہ چند سال سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت یہ تاثر قائم کیا جا رہا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات و افعال کا جو ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے اور جس کی وساطت سے ہم حضورؐ کا اسوۂ حسنہ معلوم کر سکتے ہیں بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ بلکہ یہ ایک

سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ گروہ پوری بیباکی کے ساتھ اس قسم کے باطل افکار کو مسلسل کئی برس سے پھیلا رہا ہے مگر اس گروہ کی سرگرمیوں پر کبھی ایک مرتبہ بھی گرفت نہیں ہوئی۔ بلکہ حکومت بعض حالات میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اس کا لٹریچر مختلف دفاتر میں بڑی آزادی کے ساتھ پہنچتا ہے اور حکومت کے بعض اونچے عہدے دار اس کی اشاعت میں کھلے بندوں حصہ لیتے ہیں، اور تو اور خود صدرِ محترم کے دستِ راست اور مرکزی کابینہ کے وزیر تک اس کے اجتماعات میں شریک ہو کر اس کے خیالات کی تائید کرتے ہیں اور پھر ان کی تائید کو سرکاری نشر و اشاعت کے مختلف اداروں کے ذریعے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پھیلایا جاتا ہے۔"

(ماہنامہ "ترجمان القرآن" اکتوبر ۱۹۶۸ء)

جب اہلِ دین کی تضحیک ہو رہی تھی۔ دینی فضا سیاسی ہتھکنڈوں سے زہر آلود ہو رہی تھی اور دین کے پاسبانوں کے خلاف نفرت کے جراثیم معاشرے میں پھیلائے جا رہے تھے تو اس روش کے خلاف آپ نے تحریر فرمایا:

"ملّا کی شخصیت کو ذلیل کرنے کے لیے ان ظالموں نے ان شعائرِ دین کی تذلیل کا بھی اہتمام کیا جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ہر مسلمان کے نزدیک واجب الاحترام ٹھہرایا ہے لیکن جو بدقسمتی سے صرف مولوی کے ساتھ مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان میں نمایاں مثال داڑھی کی ہے۔ ہر وہ شخص جو اسلام کا معمولی علم بھی رکھتا ہے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ داڑھی حضور سرورِ دو عالمؐ کی سُنّت ہے۔ مگر ہمارے ہاں دین سے غافل لوگ صبح شام اس پر پھبتیاں کستے رہتے ہیں اور اس کا ذکر اس مکروہ انداز میں کرتے ہیں گویا جس شخص کے چہرے پر اسلام کی یہ علامت موجود ہے، وہ جاہل، بیوقوف اور وقت کے جدید تقاضوں سے یکسر نابلد ہونے کی بنا پر ایک اضحوکہ ہے جس کا

جتنا بھی مذاق اُڑایا جائے کم ہے۔

یہ استہزاء صرف داڑھی ہی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی زد میں مولوی کا لباس اور اس کے اطوار بھی آجاتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس استہزاء سے شعائرِ دین کی توہین مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک خاص طبقہ کے چند تاریک خیال افراد کی بعض بھونڈی عادات پر ایک لطیف سی طنز ہوتی ہے تاکہ وہ ان پُرانی عادات کو ترک کر کے نئے سانچوں میں ڈھلنے کی کوشش کریں۔ مگر یہ دین سے بیزاری پھیلانے والی تحریک کا نہایت ہی سطحی مطالعہ ہے۔ بھولے بھالے لوگ یہ رائے قائم کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ جن اطوار کو وہ بھونڈی عادات کہہ کر اُن کی اہمیت کم کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے مخصوص مظاہر ہیں جو زندگی کے بارے میں خدا پرستانہ طرزِ فکر کے ترجمان ہیں۔ یہ اس بات کی واضح شہادت فراہم کرتے ہیں کہ جس تہذیب نے انہیں سوچنے اور حالات کو سمجھنے کا ایک مخصوص انداز دیا ہے، اس نے انہیں لباس و آرائش کا ایک خاص ذوق بھی عطا کیا ہے۔ اس بنا پر انسان کے ذوق کا اس کے بنیادی عقیدہ سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسان کو جس ذات سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے وہ نہ صرف اس کے افکار و نظریات کو قبول کرتا ہے بلکہ اس کے اطوار کو بھی امکانی حد تک اپناتا ہے اور یہ اس کے اخلاص کی سب سے بڑی شہادت سمجھی جاتی ہے؛ چنانچہ وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان کے دعویدار ہیں اور ایمان کی اس دولت کو دنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کی واحد کلید تصور کرتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت حضورؐ کی سُنّت کے بھی پُوری طرح متبع ہوں اور یہ اتباع اس لگن اور خوشدلی کے ساتھ کریں کہ ان کا ذوق حضور سرورِ دو عالمؐ کے ذوق کے یکسر تابع ہو کر رہ جائے۔"

(ماہنامہ "ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۷۷ء)

بھٹو کے دَور میں ظلم وستم عروجِ کمال پر تھا۔ بدعنوانیوں سے قوم بیزار تھی کسی کو امن و عافیت کے لمحات میسّر نہ تھے۔ طوق و رسن کا سلسلہ دراز تھا۔ صحافیوں کے قلم پاؤں تلے کُچل دیے جاتے تھے۔ اِن حالات میں جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور نے مالکِ حقیقی کی رضا اور خوشنودی کی خاطر الحاد کی اس یورش کے خلاف قلمی جہاد کرتے ہُوئے تحریر کیا:

"قائدِ عوام نے انسان کی ان بُنیادی ضروریات کے بارے میں اس کے نازک احساس کا پُوری طرح ادراک کرتے ہُوئے عوام سے ایسے وعدے تو کر لیے ہیں جن میں اُنہیں پُورا کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی، لیکن اس سلسلے میں عملی طور پر کچھ نہ کیا گیا، بلکہ اُن وعدوں کی دلفریبیوں میں عوام کو اُلجھا کر وقت گزارنے کی کوشش کی گئی۔ بھٹو صاحب نے اس حقیقت پر غور کرنا قطعاً گوارا نہ کیا کہ لوگوں کے صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اس کا پیمانہ جب لبریز ہو کر چھلکتا ہے، تو بڑے خوفناک طوفان اُٹھا دیتا ہے۔

پھر "فخرِ ایشیا" نے اپنے مواعید کو پُورا کرنے کے لیے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اور ان کے بارے میں عوام کے اندر جو شدید ردِّ عمل پیدا ہوا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے نتائج ہر شخص ہر آن دیکھتا اور ان کے اثرات کو زندگی کے ہر گوشے میں پُوری شدّت سے محسوس کرتا ہے اس بناء پر محض الفاظ کی بازیگری سے عوام کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا، مثلاً عوام کے ساتھ روٹی، کپڑے اور مکان کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا وعدہ تھا جس کے عملی مضمرات کو معاشرے کا ہر فرد پُوری طرح سمجھتا تھا اور توقع رکھتا تھا کہ حکومت ایسی تدابیر اختیار کرے گی جن سے اُس کی خوراک لباس اور رہائش کا مسئلہ بآسانی حل ہو جائیگا۔ مگر ہُوا یہ کہ گندم، چینی، چاول اور دیگر اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اس حد تک اضافہ کر دیا گیا جس کا عوام تصوّر تک نہ کر سکتے تھے۔ اس ہوشربا مہنگائی کے بعد عوام کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت نے روٹی پلانٹ لگا کر روٹی کا

وعدہ پُورا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام محض اس طرح کے بیانات سے تو مطمئن نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اسے اپنی بے بسی پر ایک طنز سمجھتے ہیں اور مجبوری کے عالم میں سوچنے لگتے ہیں کیا ان کا "محبوب قائد" ان کی عقل و خرد پر خندہ زن ہونے کے علاوہ ان کی بے کسی اور بیچارگی کا بھی مذاق اُڑا رہا ہے۔ اُنہیں عوام کی محبت کے اس دعویدار سے بجا طور پر توقع تھی کہ جب وہ مسندِ اقتدار پر براجمان ہو گا تو غریبوں کے مصائب و شدائد دُور ہوں گے اور اُن کے لیے زندگی کی آسانیاں پیدا ہوں گی مگر افسوس کہ نتائج اُن مصیبت زدوں کی توقعات کے بالکل برعکس نکلے۔ زندگی ان کے لیے سراپا عذاب بن کر رہ گئی۔ روزمرّہ کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے انہیں نہ صرف پانچ گُنا دام ادا کرنے پڑے، بلکہ جوانوں، بوڑھوں اور بچّوں کے علاوہ بہو، بیٹیوں کو ڈپوؤں پر پہروں لائن میں کھڑا کر کے اُن اشیاء کو بڑی دقّت، کشمکش اور منّت سماجت کے ساتھ حاصل کرنا پڑا۔ اس تشویشناک صُورتِ حال نے جو مُلک کے ہر شہری کو ہر روز پیش آتی ہے۔ عوام میں حکُومت کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کر دی ہے۔ مُھٹّو صاحب کی مقبولیت کو نفرت اور حقارت میں بدلنے کے لیے ان کی پارٹی اور ان کے جاں نثار بھی بڑی حد تک ذمّہ دار ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں ان کے ناقدین نے عوام کی نظروں میں اتنا نہیں گرایا جتنا کہ ان کے مداحوں نے ان کی شہرت کو نقصان پہنچایا ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہو گا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہیں بعض داخلی اور خارجی وجوہ کی بنا پر مغربی پاکستان میں جو غیر متوقع کامیابی نصیب ہُوئی، اُس نے خود انہیں اور ان کے یمین دلیسار میں جو لوگ تھے اُنہیں غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر اور غیر حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کا خود خوگر بنا دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنا پانچ سالہ دورِ حکومت جس آمرانہ ذہن اور عوامی مسائل سے بے نیازی کے ساتھ گزارے، اسے

دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ وہ اقتدار کو اپنی ذاتی ملکیت کی کوئی چیز سمجھ بیٹھے تھے اور رائے عامہ کے متعلق ان کے ذہن میں یہ خیال پرورش پا چکا تھا کہ یہ ایک مرکب ہے جس کے وہ تنہا راکب ہیں اور جب چاہیں گے وہ جس طرح چاہیں گے بڑی آسانی سے ان کے عنان موڑ دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے بارے میں کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور اس غلط فہمی میں گرفتار ہو کر وہ سارا عرصہ حکومت کرتے رہے۔ ان کے آمرانہ ذہن نے اپنے خلاف کسی بات کو سننا بھی گوارا نہ کیا۔ "انا ولا غیری" کا دعویٰ صرف ایک ذاتِ بے ہمتا کو ہی زیب دیتا ہے۔ لیکن جب قوّت و اختیار کی بدمستی میں حکمران یہ بڑا بول بولنے لگتے ہیں، تو وہ راہِ راست سے ہٹ کر جس اندوہناک انجام سے خود کو دوچار کرتے ہیں اس سے کون ناواقف ہے لیکن بھٹو صاحب نے ان حقائق سے کوئی عبرت نہ پکڑی۔ وہ اپنے آپ کو کبریائی کے مقام پر فائز سمجھتے ہوئے امورِ سلطنت چلاتے رہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو عقلِ کُل، ہر خطاء سے مبرّا اور ہر عیب سے منزّہ سمجھا۔ اگر کسی نے انہیں کسی بات پر ٹوکنے کی جسارت کی تو اس پر ایسا شدید عتاب نازل کیا جسے دیکھ کر دوسرے لوگ دہل گئے۔"

(ماہنامہ "ترجمان القرآن" مارچ ۱۹۷۶ء)

"ایوب صاحب کے حلقۂ ارادت سے نکلنے کے بعد انہوں نے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کے لیے جن طور طریقوں کو اپنایا انہیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ اِن طریقوں سے کام لینے والا فرد سیاست کے میدان میں تشدّد کا قائل نہیں اور دلائل کے زور سے بازی جیتنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بلاشبہ پاکستان کے دو صوبوں میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے میدان مار لیا۔ مگر جس انداز سے انہوں نے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کیں اور جس دھونس اور دھاندلی کے ذریعے انہوں نے اپنے آپ کو آگے

بڑھایا، اس سے یہ بات پُوری طرح عیاں ہے کہ یہ شخص عوام کی ذہنی تربیت کر کے آگے بڑھنے کا قائل نہیں بلکہ ان کے فکری جہاز بے لنگر کر کے اور طوفان اُٹھا کر انہیں اپنے ساتھ بہالے جانا چاہتا ہے۔ جمہوری عمل اور فاشسٹ حربوں میں جو نوعی فرق پایا جاتا ہے، وہ ووٹ کا استعمال اور عدم استعمال نہیں۔ انتخابات کا ڈھونگ تو بسا اوقات فاشسٹ ممالک میں بھی رچایا جاتا ہے مگر یہ ڈھونگ ہی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد رائے عامہ کو آگے بڑھ کر کام کرنے کا موقع فراہم کرنا نہیں ہوتا۔ جمہوریت اور فاشزم کے مابین اساسی فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں عوام کے شعور کو جِلا دے کر اسے یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ قومی تعمیر و ترقی کی نہ صرف راہ متعیّن کرنے بلکہ عملاً اس پر گامزن ہونے کے طور طریقے بھی بتائے۔ اس کے بعد جن لوگوں کو عوام کی قیادت اور سربراہی کے لیے منتخب کیا جائے۔ اِن کے افکار و اعمال کا برابر محاسبہ بھی کرتا رہے۔ آپ اگر کسی ملک میں جمہوری عمل کا مطالعہ کریں تو آپ کو واضح طور پر یہ معلوم ہو گا کہ جمہوریت ایک ایسا تربیتی ادارہ ہے جس میں آزادی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ انسانوں کے شعور کی بھی باقاعدہ تربیت کی جاتی ہے اور اسے بیدار رکھنے کا بھی پُورا التزام ہوتا ہے۔ اس بناء پر جو جماعتیں جمہوری عمل کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ پہلے مرحلے پر ارکان کی تربیت کرتی ہیں اور انہیں سوچنے اور سمجھنے کا تعمیری انداز عطا کرتی ہیں تاکہ وہ فیصلہ کُن مراحل پر ٹھیک ٹھیک قدم اُٹھا سکیں۔ لیکن اس کے بَرعکس جو جماعتیں فاشسٹ عزائم لے کر اُٹھتی ہیں وہ عوام کے شعور کو بیدار کرنے کے بجائے ان کے اندر ہیجانی کیفیات پیدا کرتی ہیں تاکہ شعور معطّل ہو کر رہ جائے اور وہ جذبات کے دھارے میں عوام کو جس رُخ چاہیں بہا کر لے جائیں۔ یہ جماعتیں اپنی صلاحیتیں لوگوں کی ذہنی تربیت کرنے میں نہیں کھپاتیں بلکہ عوام سے جھوٹے وعدے کرنے، انہیں مستقبل کے بارے میں سہانے خواب دکھانے، ان کے ذہنوں کو مفلوج کرنے،

مخالفین کو گالیاں دینے اور انہیں بدنام کرنے اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے غنڈوں اور سماج دشمن عناصر کو اپنے ساتھ شامل کر کے ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے میں صرف کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے وجود سے معاشرے میں جمہوری عمل یکسر معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور انتخابات رائے عامّہ کے اظہار کا ذریعہ بننے کے بجائے فاشسٹ رہنماؤں کی غیر معمولی طاقت کی نمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور فاشزم کے علمبردار لیڈر جو کچھ فوج اور گولی کی قوّت سے حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ وہ انتخابات اور ووٹ کے ذریعے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ صدر بھٹو نے جس انداز سے اپنی پارٹی کے کارکنوں کی تربیت کی ہے اور آج بھی وہ ان سے جس طرح کام لے رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے کوئی عقلمند شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ صدر صاحب اس ملک میں جمہوری عمل کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ ان کے طور طریقوں پر تو فاشزم کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس بناء پر عین ممکن ہے کہ قوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کا جو سودا ان کے دل میں سمایا ہوا تھا اس نے وقت گزرنے کے ساتھ کسی خوفناک مرض کی صُورت اختیار کر لی ہو جس کی وجہ سے وہ بار بار اس خطرے کو مخالف جماعتوں کے جسم سے سونگھ رہے ہیں۔ درآنحالیکہ اس خطرے کا احساس تو ان کے اپنے دل و دماغ میں موجود ہے۔ صدر صاحب کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۷۳ء)

"گزشتہ بارہ سال سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی متحرک زندگی کے مختلف گوشے مختلف حیثیتوں سے عوام کے سامنے آ رہے ہیں۔ قوم نے انہیں فیلڈ مارشل ایوب خاں کے مصاحبین اور درباریوں کے جلو میں ایک وزیر کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے۔ پھر انہیں ایوب خاں کی مخالفت اور مخاصمت میں بھی سرگرم عمل پایا ہے۔ اس کے بعد انہیں عوام کے جذبات میں ہیجان

پیدا کر کے مسندِ اقتدار سنبھالتے بھی دیکھا ہے۔ اور اب دس ماہ کی کارگزاریوں کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ہے، مگر ہم نے بارہ سال کی اس طویل مدّت میں انہیں کوئی ٹھوس اور دانشمندانہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ ایّوب خاں کے ساتھ انہوں نے پہلے آٹھ سال تو اس درجہ نیاز مندی سے گزارے کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی اپنی کوئی الگ فکر اور سوچ نہیں۔ ان کا بیشتر وقت فیلڈ مارشل صاحب کی ثنا خوانی میں گزرتا تھا۔ وہ انہیں ملک کے واحد نجات دہندہ کی حیثیت سے ہر محفل اور مجلس میں پیش کرتے رہے اور انہیں یہ باور کراتے رہے کہ جو شخص یا گروہ بھی آپ سے اختلاف کرتا ہے، اسے پاکستان میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ملک میں بلاشرکتِ غیرے صرف آپ کا راج ہونا چاہیے اور جو فرد بھی اسکے خلاف لب کشائی کرتا ہے، وہ وطن اور قوم کا دشمن ہونے کی بناء پر گردن زدنی ہے۔ اس سارے عرصے میں بھٹو صاحب ایّوب صاحب کو اپنے مخالفین کو ختم کرنے، خصوصاً دینی طبقوں کو مٹانے اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کو سرکاری پارٹی کے عہدے تفویض کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔

جب اپنے اس محسن اور مُربّی سے اختلاف ہُوا تو اُنہوں نے معاہدۂ تاشقند کے بارے میں عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہُوئے اس مسئلے کو خوب اچھالا اور سادہ لوح عوام کو یہی تاثّر دیا کہ وہ اس پٹاری سے کوئی خوفناک چیز نکالنے والے ہیں۔ اس معاہدے کی بین بجا کر اُنہوں نے عوام کو اپنے گرد جمع کیا۔ پھر جھُوٹی توقعات اور اُمیدوں کے سحر سے ان کے ہوش و حواس کو معطل کیا اور اپنے مخالفین کے خلاف نہایت مکروہ پراپیگنڈہ کر کے تختِ اقتدار پر پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کیا اور بالآخر "اُدھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ لگا کر ایسے حالات پیدا کیے کہ عنانِ اقتدار پر ان کا قبضہ ہو ہی گیا۔ جب ہم صدر بھٹو صاحب کی گزشتہ بارہ سال کی سرگرمیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ محض

کھیل تماشا معلوم ہوتی ہیں۔ معاہدہ تاشقند کی پٹاری کو سامنے رکھ کر مجمع بازی کا کام تو خوب لیا گیا، مگر اس میں سے کوئی خوفناک چیز برآمد نہ ہوسکی۔ جھوٹی توقعات سے عوام کو مسحور کر لیا گیا، مگر اس سحر سے ان بے چاروں کی شبِ تاریک کا خاتمہ نہ ہوسکا۔ البتہ کوتاہ اندیشوں کو کچھ وقت کے لیے افق کے کناروں پر صبح کے آثار دکھائی دینے لگے۔ مگر جلد ہی ان پر حقیقت آشکار ہوگئی کہ یہ صبح صادق نہیں بلکہ صبح کاذب ہے جس کا مقصد دھوکے سے شبِ تاریک کو طوالت دینا ہے۔

مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد بھی ان کے طرزِ عمل میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ جس مارشل لا کو وہ برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے اسے برقرار رکھنے پر پہلے مُصر رہے اور اس کے لیے فضا ہموار کرنے کی پوری پوری کوشش کی، مگر جب مخالف جماعتوں نے جبر و اکراہ کے ساتھ اس لعنت کو ایک معیّنہ مدّت تک گوارا کرنا قبول کر لیا تو دفعتاً اس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس آناً فاناً اعلان کا مقصد یہ تھا کہ اس لعنت سے نجات دلانے کا سہرا کہیں حزبِ اختلاف کے سر نہ بندھ جائے، بلکہ وہ تنہا صدر قوم کی پیشانی کی زینت بنے۔ اسی طرح وہ ایوب خاں کے حلقۂ ارادت سے نکلنے کے بعد اور تختِ اقتدار سنبھالنے سے پہلے صدارتی نظام کے مخالف اور وفاقی پارلیمانی نظام کے پُرجوش مبلّغ اور داعی رہے اور ہر جگہ یہی کہتے رہے کہ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہمارے لیے پارلیمانی نظام ہی صحیح اور مناسب ہے مگر اقتدار پر قابض ہونے کے فوراً بعد ہی صدارتی نظام کے گُن گائے جانے لگے اور اسے ملک و ملّت کے لیے کیمیائے سعادت ثابت کیا جانے لگا۔ اسے برقرار رکھنے پر اس قدر زور دیا گیا کہ پُورا ایوانِ حکومت متزلزل ہو گیا اور اس کے نتیجے میں نہ صرف وزیرِ قانون اپنے عہدے سے الگ ہو گئے بلکہ بعض نمایاں کارکنوں نے بھی حکومت سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔

بھٹو صاحب کی اس سیماب آسا طبیعت اور طفلانہ مزاج نے ہمیں بین الاقوامی طور پر بھی اچھا خاصا نقصان پہنچایا اور دُنیا کی نظروں میں ہمارا قومی وقار ناقابلِ بیان

حد تک گرا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ان صاحب نے یو۔این۔او میں جو تقریر ارشاد فرمائی اور جس کے معرکہ آرا، ہونے کا ملک میں خوب چرچا کیا گیا وہ محض ایک جذباتی تقریر تھی۔ جو ممکن ہے کہ موچی دروازے کے جلسے کے لیے موزوں ہو، مگر بین الاقوامی مدّبرین کی مجلس کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہ تھی۔ امریکہ اور انگلستان کے پریس نے الفاظ کے تھوڑے سے تغیّر و تبدّل کے ساتھ اسے ایک نابالغ اور خام سیاستدان کی سطحی جذباتیت سے تعبیر کیا۔ خصوصاً انہوں نے تقریر کے دوران بھارت کے نمائندے کو جن غیر شائستہ الفاظ سے مخاطب کیا تھا، اس کی ہر جگہ مذمّت کی گئی۔ وہ ملک کے اندر یو۔این۔او کے اجلاس میں اور پریس کانفرنسوں میں بھارت کے خلاف ایک ہزار سال جنگ کرنے کی رَٹ لگاتے رہے مگر جب ذرا خارجی دباؤ پڑا تو وہ اور ان کے مربّی فوراً تاشقند روانہ ہو گئے اور وہاں اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے جیتی جنگ کو مذاکرات کی میز پر ہار دیا اور اعلانِ تاشقند کے ساتھ ملک میں بے نیل و مرام لوٹے۔ معاہدۂ تاشقند کے سارے مراحل میں وہ ایوب خاں کے ساتھ برابر شریک رہے۔ ان کی جو تصاویر اُس وقت ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں ان میں انہیں اس معاہدہ کی خوشی میں تالیاں پیٹتے دیکھا گیا۔ ملک کے اندر واپس آنے کے بعد اُنہوں نے اس معاہدے کی بھرپور حمایت کی اور اسے محمد ایوب خاں کی فراست کا شاہکار قرار دیا۔ پھر اسمبلی میں اُنہوں نے اس معاہدے کے حق میں پُورے ڈھائی گھنٹے جو تقریر ارشاد فرمائی، اس میں اس کی بے حد تعریف کی اور اسے پاکستان کی فتح سے تعبیر کیا مگر جب فیلڈ مارشل صاحب سے اَن بن ہو گئی، تو یہ معاہدہ ایک سازش بن گیا اور اس کا ذمّہ دار ایّوب خان کو ٹھہرایا گیا، خود اس سے بالکل برّی ہو گئے۔ اگر یہ معاہدہ واقعی ایک سازش تھی تو تاشقند میں اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا جا سکتا تھا اور وطن واپس آکر عوام میں اس امر کی دہائی دی جا سکتی تھی مگر اس وقت تک اس سازش کو اخفا میں رکھا گیا بلکہ اس سازش کو صدرِ مملکت کا عظیم کارنامہ

قرار دیا جاتا رہا یہاں تک کہ انہیں وزارتِ خارجہ کے منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں وزارت کا منصب ملکی مفاد سے کہیں زیادہ عزیز تھا اور جب اس کے ساتھ چمٹے رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو پھر معاہدہ تاشقند کے پس پردہ جو سازش تھی اسے آشکارا کرنے کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں مگر آج تک اس سازش سے ہزار وعدوں کے باوجود پردہ نہیں اٹھایا گیا اور وہ ابھی تک صیغۂ راز ہی میں ہے۔

اقتدار سے الگ ہونے کے بعد ان کی اس روش میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی اگر وہ باہر کی دُنیا کی طرف متوجہ ہوتے تو بھارت کے خلاف ہزار سال تک جنگ کرنے کی دھمکیاں دیتے۔ کبھی اہلِ بھارت کو یہ وعید سناتے کہ وہ عنقریب لال قلعے پر جھنڈا گاڑنے کے لیے اپنے لاؤ لشکر سمیت آ رہے ہیں۔ کبھی وہ بھارت کے وزیرِ خارجہ کی نقلیں اتارتے اور ان کے دُوسرے لیڈروں کا مذاق اُڑاتے اور اس طرح جلسوں میں عوام کو ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کرتے۔ جب زبان پر امریکہ کا ذکر آتا تو اسے بھی خوب گالیاں سناتے۔ مگر چند لمحے بعد ہی اگر امریکی پریس کے کسی نمائندے سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو پھر امریکہ بہادر کی تعریف و توصیف شروع کر دیتے۔ ملک کے اندر ایک ہی سانس میں اسلام کا دم بھرتے اور سوشلزم کا نعرہ بھی لگاتے۔ ایک جلسے میں سائنٹیفک سوشلزم کے داعی کی حیثیت سے تقریر کرتے تو دُوسرے جلسے میں اسلام کے جاں نثار فدائی ہونے کا دعویٰ کرتے۔ اپنے آپ کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کا شدید دشمن قرار دیتے مگر اپنے دربار میں ان طبقوں کی سب سے زیادہ پذیرائی بھی کرتے اور ان کے وجود سے اپنی مجالس سجاتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بارے میں کوئی بات بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ان کے کسی قول پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس شخص کی ساری زندگی ہی لاف و گزاف اور کہہ مکرنی سے عبارت ہو اس پر اپنے اور پرائے کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔ ان کے بعض انجان

اور عقل سے عاری ساتھی ان کے اس طرزِ عمل کے دفاع میں یہ کہتے کہ سیاست اسی کا نام ہے۔ لیکن انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ اس قسم کے چھچھورے پن سے سیاستدان کی اپنی ذات اور اس کی قوم کے وقار کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ سیاست کی بساط قومی مفادات کی مہرہ بازی ہی سہی، لیکن اس میں جتنی سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ کیا جائے، اسی قدر سیاستدان کی آبرو اور اس کی قوم کی عزّت بڑھتی ہے۔ ماضی قریب ہی میں ہمارے مسٹر محمد علی جناح کی صورت میں ایک ایسے نامور سیاستدان ہوئے ہیں۔ جن کی سیاسی قابلیت کا سکّہ مسلمان تو کیا غیر مسلم تک مانتے ہیں۔ مگر دیکھیے کیا ان کی زبان سے کبھی ایسی طفلانہ حرکتیں سرزد ہوئیں جنہیں وہ آج اپنی سیاست بازی کا سب سے بڑا امتیاز سمجھتے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی اپنے مخالفین کو اسی انداز کی سوقیانہ گالیاں دیں جو آج صدر بھٹو کی زبان سے سننے میں آتی ہیں؟ کیا انہوں نے بھی اپنے مخالفین کی نقلیں اتار کر اور ان کے سوانگ بھر کر سامعین کو ہنسانے کی کبھی کوشش کی؟ کیا وہ بھی اسی طرح کی لاف زنی کے عادی تھے۔ جس طرح کی لاف زنی بھٹو صاحب کا آج شیوہ بن گئی ہے۔ کیا انہوں نے بھی اہم معاملات کے فیصلے کے لیے وہ انداز اختیار کیا جو انداز بھٹو صاحب نے مجیب کی رہائی کے لیے اختیار کیا تھا یا آج بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لیے کر رہے ہیں۔ اسلامی سیاست تو خیر اخلاق اور سنجیدگی کے نہایت اونچے معیار کی طالب ہوتی ہے مگر مغربی سیاست میں بھی ان صفات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اگر بساطِ سیاست سے یہ صفات ناپید ہو جائیں، تو پھر سیاست دان اور مجمع باز میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۷۲ء)

○

جناب عبدالحمید صدیقی نور اللہ مرقدہٗ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد

بھی ذوق وشوق سے ادا کرتے تھے اور قرآن پاک کی اس آیت پر سختی سے عمل کرتے تھے۔

وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ۔ (النساء ۳۶)

اور خدا کی ہی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرو۔ ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں، غریبوں، اُن پڑوسیوں کے ساتھ جو اجنبی ہوں یا رشتہ دار، رفقائے پہلو کے ساتھ اور اُن زیردستوں کے ساتھ جو تمہارے قبضہ میں ہوں

والدین سے حُسنِ سلوک

آپ والدین سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے اور اس حسنِ سلوک کی توفیق کو دونوں جہانوں کی سعادت سمجھتے تھے۔ آپ کا سینہ اُن کی عقیدت اور احسانمندی کے جذبہ سے سرشار تھا اور دل کا ریشہ ریشہ ان کا شکر گزار تھا۔ ہمارے والد مرحوم جب تک زندہ رہے صدیقی صاحب نے کبھی بھی ان کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ والد صاحب کی وفات کے بعد اکثر ان کی قبر پر حاضری دیتے اور خدا تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دُعا کرتے۔

رَبِّ ارۡحَمۡهُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا۔

پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح ان دونوں نے کبرسنی میں میری پرورش کی تھی"!

والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ محترمہ ہماری محبت کا واحد مرکز بن گئیں۔ برادرِ محترم کو ان سے بے پایاں محبت تھی۔ آپ زبردست مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر ہر روز ان کے پاؤں دبانا کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ آپ ان کے ساتھ

کھانا تناول فرماتے۔ بذاتِ خود ان کی نگہداشت کرتے تھے۔ آپ دل کی گہرائیوں سے والدکا احترام کرتے اور نہایت منکسرانہ انداز میں ان کے سامنے گفتگو کرتے تھے۔ آپ قرآن پاک کے ان ارشادات پر پوری طرح عمل کرتے تھے:

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (بنی اسرائیل: ۲۳)

اور ان (والدین) سے احترام سے بات کیجیے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ۔ (بنی اسرائیل ۲۴)

اور عاجزی اور نرمی سے ان کے سامنے بچھے رہو۔

جناب صدیقی صاحب مرحوم و مغفور کبھی کبھی فرطِ محبت سے والدہ کے پاؤں کے نیچے اپنا سر رکھ دیتے اور فرماتے کہ اس طرح مجھے بے حد لطف محسوس ہوتا ہے لیکن والدہ اپنے پارسا اور عظیم فرزند کو ایسا کرنے سے منع فرماتیں۔ بھائی جان کا اصرار اور والدہ ماجدہ کی طرف سے انکار کا سلسلہ کافی عرصہ جاری رہتا۔ بعض اوقات یہ تکرار نہایت ہی دلچسپ صورت اختیار کر لیتی۔ اگر والدہ محترمہ بیمار ہو جاتیں تو برادرِ محترم بے کل ہو جاتے اور تمام رات جاگ کر ان کی تیمارداری کرتے۔ والدہ آپ کے بغیر اور آپ والدہ کے بغیر چند ایام بھی نہیں گزار سکتے تھے لیکن اب غمزدہ والدہ خون کے آنسو روتی ہیں کیونکہ بڑھاپے میں ان کا عصا ٹوٹ گیا ہے۔ ان کے لیے یہ صدمۂ جانکاہ قیامت سے کم نہیں، لیکن یہ مشیتِ ایزدی ہے۔ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ جب سے یہ عظیم اور مایۂ ناز فرزند انہیں داغِ مفارقت دے کر چلا گیا ہے۔ ان کے دل کی بستی اُجڑ گئی ہے اور گھر کی تمام رونقیں ختم ہو گئی ہیں۔ ان کا سینہ چھلنی چھلنی ہو گیا ہے اور آنکھیں ہر وقت اشکوں سے لبریز رہتی ہیں، وہ نورِ نظر کو تلاش کرتی ہیں۔ لیکن ان کی قسمت میں اندھیروں کے سوا کچھ نہیں۔

تم کیا گئے کہ دل میں اندھیرا سا چھا گیا
شمعِ حیات ہو گئی مدھم ترے بغیر

ازدواجی زندگی

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور نے نہایت کامیاب ازدواجی زندگی بسر کی۔ آپ نے ہمیشہ ہماری بھاوج کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جو قلبی تعلق اور جذبۂ رفاقت کے شایانِ شان ہو۔ آپ نے ان کے حقوق تازیست کشادہ دلی سے ادا کیے اور ہر معاملہ میں احسان، ایثار، تحمل اور عالی ظرفی کی روش اختیار کی۔ ہم نے زندگی کا طویل عرصہ برادرِ محترم کے سایۂ شفقت میں گزارا ہے لیکن کبھی بھی بھائی اور بھاوج کے درمیان کشیدگی ہوتے نہیں دیکھی۔ میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ برادر محترم ایک صالح خاوند ہونے کی حیثیت سے ہر لمحہ قرآن پاک کے اس حکم پر من و عن عمل کرتے تھے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔

اور ان (زوجین) کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی گزارو۔

بھائیوں کے بارے میں طرزِ عمل

جناب عبدالحمید صدیقی نور اللہ مرقدہٗ نے والدِ مرحوم کی وفات کے بعد خاندان کا بارِ گراں اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا اور اس فرض کو بطریقِ احسن سرانجام دیا۔ خود تکالیف برداشت کرتے رہے لیکن اہل و عیال کو حوادثِ زمانہ کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ آندھیاں اُٹھیں تو آپ نے ان کی زَد پر چراغ جلائے۔ طوفان میں گھر کر بھی آپ ثابت قدم رہے اور زخم کھانے کے باوجود مسکراتے رہے۔ بھائیوں کے لوازماتِ زندگی فراخ دلی سے پورے کیے۔ انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ اعلیٰ ملازمتیں حاصل کر سکیں۔ میں اکثر بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ہمیں جناب صدیقی مرحوم جیسا مشفق اور جذبۂ ایثار رکھنے والا بھائی

نصیب نہ ہوتا تو شاید ہمارے حالات دگرگوں ہو جاتے اور ہم معاشرہ میں اعلےٰ مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ برادرِ محترم نے اولاد کی طرح ہماری پرورش کی۔ آپ ہمیشہ حکمت و سوز کے ساتھ ہماری تربیت کرنے کی محبت آمیز کوشش کرتے اور ہماری کوتاہیوں پر بیزار ہونے یا اظہارِ نفرت کرنے سے اجتناب کرتے۔

والد مرحوم کے انتقال کے بعد ہمارے لیے برادرِ محترم ایک مضبوط سہارا تھے لیکن اب ہم اس سہارے سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہم منجدھار میں ہیں اور کنارے ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ شدّتِ غم سے دل ٹوٹ چکا ہے، دماغ معطل ہے، حواس ماؤف ہو رہے ہیں۔ سکون کا مرکز کہیں نظر نہیں آتا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ بقول شاعر ؎

سوائے مرگ نہیں کچھ علاجِ دردِ فراق
اَجل کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم دُعا کیلئے

اولاد سے حُسنِ سلوک

برادرِ محترم اولاد کو خدا کا انعام سمجھتے تھے۔ آپ کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ صرف تین بچیاں ہیں۔ آپ ان کی تربیت و پرورش انتہائی خوش دلی، رُوحانی مسرت اور دینی احساس کے ساتھ کرتے اور اس کے صلہ میں خدا سے بہشتِ بریں کی آرزو کرتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کے سامنے اولادِ نرینہ سے محرومی کا تذکرہ کرتے ہوئے اظہارِ تاسف کرتا تو آپ خفیف سی برہمی کا اظہار کرتے اور رسولِ خداؐ کے اس ارشاد کا حوالہ دیتے:

"جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی، انہیں تعلیم و تہذیب سکھائی اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا یہاں تک کہ خدا انہیں بے نیاز کر دے تو ایسے شخص کے لیے خدا نے جنّت واجب فرما دی۔"
(مشکوٰۃ)

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ برادرِ محترم کی تین بچیاں ہیں۔ آپ نے انہیں پاکیزہ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے میں اپنی ساری کوششیں وقف کردی تھیں۔ آپ نے قرآنِ پاک کے احکام پرعمل کرتے ہوئے اس دینی ذمّہ داری کو بطریقِ احسن پورا کیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا

مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آتشِ جہنم سے بچاؤ۔

چونکہ دوزخ کی آگ سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آدمی دین کے علم سے بہرہ مند ہو اور اس کی زندگی خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں گزر رہی ہو۔ برادرِ محترم نے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عزیز بچیوں کو اسلامی، اخلاقی اور روحانی اقدار سے پوری طرح روشناس کرانے کے لیے پوری تندہی سے جدوجہد کی اور یہ آپ کی دعاؤں اور تربیت کا ثمر ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیمیافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ عفت، پارسائی اور شرافت کی زندہ تصاویر ہیں۔ وہ بچیاں جنہیں دیکھ کر آپ کے چہرہ پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی اب غم و آلام کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہیں۔ وہ اس پُرنور چہرہ کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں جو ان کے دلوں کی دُنیا کے لیے موجب نور تھا۔ وہ اپنے شفیق والد کی مبارک آواز اور اس لب و لہجہ کو جس میں خلوص اور اُلفت کی شیرینی تھی سُننے کے لیے مضطرب ہیں لیکن ابّاجی! ابّاجی کی صدا کا کوئی جواب انہیں موصول نہیں ہوتا۔ والد کا دائمی سکوت ان کے لیے نہایت اذیت دہ ہے۔ ان کا عظیم باپ ان سے دُور بہت دُور جا چکا ہے۔ اب گلے لگا کر پیار کرنے والا شفیق باپ محض خواب ہو کر رہ گیا ہے۔

آپ کی فرقت میں ہر چھوٹا بڑا مغموم ہے
مضمحل مضطر، پریشاں دید سے محروم ہے

احباب سے تعلقات

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ آپ نیک اور

صالح دوستوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات قائم کر کے ان کے لیے مرکزِ محبت بن جاتے تھے۔ آپ دوستوں سے ہمیشہ نرم خوئی، مسرّت اور اخلاص سے ملتے تھے۔ بے نیازی اور سرد مہری سے ہر لمحہ گریز کرتے تھے۔ آپ ان کے غم میں شریک ہو کر غم غلط کرنے کی کوشش کرتے اور ان کی مسرّتوں میں شامل ہو کر فرحت و انبساط میں اضافہ کرتے تھے۔ ہر دوست بجا طور پر یہ توقع رکھتا تھا کہ آپ مصیبت میں اس کا ساتھ دیں گے۔ ایک دفعہ آپ کا ایک دوست اختلاجِ قلب کا مرض ہو گیا۔ وہ زندگی سے بیزار نظر آنے لگا۔ دوستوں کے نزدیک یہ وحشتِ دل نفسیاتی بیماری تھی۔ برادرِ محترم نے اس کا علاج کرانے کا فیصلہ کیا۔ آپ ہر روز شام کو اس کے ہاں جاتے اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے۔ اسے اپنے ہمراہ سیر کے لیے باہر لے جاتے۔ اس طرزِ عمل کا اس پر خوشگوار اثر ہوا اور وہ رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گیا۔

برادرِ محترم خود پریشان ہونے کے باوجود دوستوں کو افسردہ کرنے سے پرہیز کرتے اور ان کی صحبت میں بے تکلّف اور خوش مزاج رہتے تھے۔ آپ پر جب پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا تو ایک صاحب مزاج پُرسی کے لیے تشریف لائے۔ اس وقت کئی اور احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ آپ کی زبان ماؤف تھی۔ اس کے باوجود آپ شگفتہ مزاجی اور تکلیف سے بے نیاز ہو کر اشاروں سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ کو اس مجبوری کی حالت میں دیکھ کر نووارد کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ جب مرحوم نے دیکھا تو کم ہمتّی پر اسے ملامت کرنے لگے اور کبھی کبھی اس سے مذاق کرنے لگتے۔ اس کی دلجوئی کے لیے آپ بار بار فرماتے:

"میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا تم بڑے کم ہمّت ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ تم تو عورتوں سے بھی زیادہ کمزور دل ہو۔"

مرحوم کی اس مومنانہ شان اور جرأت پر سب احباب حیران ہو رہے تھے۔

آپ اپنے دوستوں کی ناگوار اور خلافِ ذوق باتوں کو حکمت اور نرمی سے ٹال دیا

کرتے تھے۔ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے تھے جس سے دُوسروں کے جذبات مجروح ہوں۔ اگر کبھی کسی بات پر اختلاف ہوجاتا تو فوراً صُلح کر لیتے اور غلطی کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں آپ ہمیشہ اپنے احباب کا تعاون حاصل کرتے اور انہیں معقول معاوضہ ادا کرتے۔ ایک دفعہ مرحوم نے ایک دوست کی معاونت سے کچھ تحریری کام کیا۔ ناشر اُجرت کی ادائیگی میں لیت و لعل سے کام لینے لگا آپ کو جو کچھ وصول ہوتا وہ معاون کو ادا کر دیتے اور خود کچھ بھی نہ لیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد معاون کو احساس ہُوا کہ ناشر نے کچھ نہیں دیا اور مرحوم اپنے پاس سے اسکی مدد کر رہے ہیں۔ اس نے آپ کو نصف رقم واپس کرنے کی کوشش کی، لیکن آپ نے وصول کرنے سے انکار کر دیا اور رقم کی ادائیگی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے بار بار معذرت پیش کرتے رہے۔ اس مادہ پرستانہ ماحول میں دوست تو ہوں گے لیکن ایسے سیر چشم محسنوں کا ملنا محال ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنے والے میں

قِصّہ مختصر زندگی آپ کے نقشِ پا سے راستہ ڈھونڈتی تھی۔ شرافت آپ پر ناز کرتی تھی۔ مجروح قلوب آپ کے انفاس سے مرہم شفا حاصل کرتے تھے۔ بے کس اور درماندہ افراد آپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے تھے۔ آپ شمع کی مانند خود پگھلتے رہے مگر مخلوقِ خدا پر ضوفشانی کرتے رہے۔ خود جلتے رہے لیکن دوسروں کو جلا بخشتے رہے۔ خود مضطرب رہ کر دوسروں کو راحت اور سکون عطا کرتے رہے۔ آپ اہل و عیال اور عزیز و اقارب کے علاوہ غریبوں، یتیموں، مسافروں اور بیکسوں کے مشفق اور مربی تھے۔

○

عادات وشمائل

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم ومغفور اعلیٰ اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے اندر ایسی شانِ محبوبیت تھی کہ جو سلیم الفطرت انسان آپ سے ملتا، آپ کی مجلس میں بیٹھتا، آپ کی شیریں گفتگو سنتا تو آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص آپ کی نورانی شخصیت اور حسنِ اخلاق سے متاثر نہ ہو۔ آپ اخلاقِ حسنہ کی مجسم تصویر تھے۔ آپ حضورؐ کی حسبِ ذیل حدیث کے مطابق کامل مومن تھے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ مومنین میں کامل ترین ازروئے ایمان وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں (ترمذی)

یوں تو آپ اوصافِ حمیدہ کے پیکر تھے، لیکن یہاں صرف چند نمایاں خصوصیات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی شخصیت کے یہ پہلو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکیں۔

جود وسخا

برادرِ محترم دولت مند اور سرمایہ دار نہ تھے، لیکن اللہ کے فضل وکرم سے گزر اوقات کے لیے ان کی آمدنی معقول تھی۔ جب آپ سخاوت کرتے تو حاتم کے مثیل نظر آتے تھے۔ آپ حضورؐ کی اس حدیث کے مطابق راہِ خدا میں جس قدر زیادہ سخاوت کرتے اللہ تعالیٰ آپ کے لیے خزانوں کے دروازے کھول دیتا۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ یُنْفَقْ عَلَیْكَ۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ ربّ العزت فرماتا ہے کہ اے ابنِ آدم! تو (میری مخلوق پر) خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔

جناب عبدالحمید صدیقی نوراللہ مرقدہٗ بے حد فراخ دل، فیاض اور کشادہ دست تھے۔ آپ کبھی کسی سائل و نادار کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے اور بساط کے مطابق ضرور اس کی اعانت فرماتے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک آدمی پیچھے ہولیا۔ آپ نے آہٹ سُنی تو رُک گئے، اس سے پوچھا کیا بات ہے؟ اُس نے عرض کیا "حضور غریب آدمی ہوں، شدید سردی کا موسم ہے سکت نہیں کہ جوتا خرید سکوں۔ خدارا میری امداد کیجیے۔" آپ نے وہیں اپنا جوتا اتارا اور اسے دے دیا اور خود برہنہ پا گھر تشریف لے آئے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے ہزارہا لوگ ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ گزین ہوئے۔ ان خانماں برباد لوگوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ یہ دربدر کے دھکّے کھا رہے تھے۔ اور امدادی کیمپوں میں شدید مصائب سے دوچار تھے۔ ان کے پاس نہ تو تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا تھا اور نہ ہی کھانے کے لیے خوراک۔ ان کی زندگیاں محض کاوشِ بیداری تھیں۔ ان حالات میں اس دردِ دل رکھنے والے انسان نے ان مفلوک الحال لوگوں کی دلجوئی کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ آپ مخیر حضرات کے تعاون سے کھانا تیار کراتے اور امدادی کیمپوں میں لے جا کر فاقہ مستوں کو کھلاتے۔ آپ نے موسم کے مطابق کپڑے جمع کر کے مہاجرین کو بطور امداد دیئے۔ مہاجرین کے ایک کیمپ میں ایک حافظِ قرآن سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ وہ سخت مغموم تھا اس کی حالتِ زار دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا۔ آپ اسے گھر لے آئے اور ہمیں اس کی خدمت کرنے پر مامور کر دیا۔ وہ حافظِ قرآن ہمارے پاس چار سال تک رہے اور برادرِ محترم خود ان کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے۔

عرصہ ہوا میں ایک نجی ادارہ میں بحیثیت صدر معلم خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ برادرِ محترم نے مجھے ہدایت فرمائی کہ اپنے ہاں ایک نادار طالب علم کی تعیناتی بطور مدرس کر لوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ طالب علم بھائی جان کی زیرِ کفالت ہے اور اس کا ذہنی توازن درست نہیں۔ چونکہ میں انکار کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں

نے بلا تامل آپ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی کیونکہ مدرس مذکور کا طرزِ عمل نہایت غلط اور ناقابلِ برداشت تھا۔ سکول کے طلباء اس سے نالاں تھے۔ انتظامیہ اس کے خلاف تھی۔ مَیں نے تنگ آکر اسے مُلازمت سے سبکدوش کر دیا۔ اس نے برادرِ محترم کے پاس میرے بارے میں شکایت کی۔ آپ نے تنخواہ کی رقم کے مساوی اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ایک دن وہ برادرِ محترم کے پاس بیٹھا ہوا میرے خلاف زہر افشانی کرنے میں مصروف تھا میں صبر و تحمّل سے اس کے اس اندازِ تکلّم کو برداشت کرتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے برادرِ محترم کے سامنے دست بستہ عرض کیا:

"بھائی جان! یہ شخص کتنا نمک حرام ہے کہ اپنے اس محسن کے خلاف لب کشائی کرتے ہُوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتا جس نے دیوانہ ہونے کے باوجود اس کی تقرری کر دی اور جب میں نے اسے ملازمت سے سبکدوش کیا تو آپ نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بھائی جان میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کی ہرگز امداد نہ کریں، کیونکہ یہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔"

برادرِ محترم نے میری گفتگو کو غور سے سُنا اور تاریخِ اسلام کا یہ واقعہ مجھے سنایا۔

"مکّہ میں ایک وظیفہ خوار عورت حضورؐ کے خلاف ہر وقت ہرزہ سرائی کرتی رہتی تھی۔ ایک دن آپؐ کے جاں نثار صحابی حضرت عمرؓ نے اسے حضورؐ کی شانِ اقدس میں گستاخانہ کلمات کہتے ہُوئے سُنا۔ وہ بے حد برہم ہُوئے ان کا جی چاہتا تھا کہ اس دریدہ دہن کی زبان کاٹ دیں لیکن حضورؐ کی ناراضگی کا ڈر تھا۔ حضرت عمرؓ آقائے نامدارؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ اس عورت کے بارے میں شکایت کی اور مشورہ دیا کہ اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے۔ رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا: اے عمر! ہم اس عورت کے رازق نہیں۔ روزی رساں تو قادرِ مطلق ہے جو ان لوگوں کو بھی رزق فراہم کرتا ہے جو اس کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے یا بتوں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اس وجہ سے ایک عورت کا وظیفہ بند

کر دیں کہ وہ ہمیں گالیاں دیتی ہے۔ ہمیں صرف اس کی اصلاح کے لیے دُعا کرنی چاہیے“۔

یہ واقعہ سُن کر میں آبدیدہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ مُجھ جیسے انسان کا ظرف کتنا تنگ ہے مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میرا بھائی اس آدمی کی مدد کرے جو میرے خلاف ہو۔ اور میرا بھائی اتنا عالی ظرف اور فیاض ہے کہ تنخواہ کے برابر اس کے لیے ماہانہ مشاہرہ مقرر کر دیا ہے اور پھر اس سے درخواست کرتا ہے کہ میرے چھوٹے بھائی کے لیے دُعا کرنا کہ وہ سدا خوش و خرم اور آفات سے محفوظ رہے۔

جب آپ پر پہلی دفعہ فالج کا حملہ ہوا تو ایک آدمی آپ سے مُلاقات کرنے کے لیے حاضر ہُوا۔ اس نے برادرِ محترم کی خدمت میں عرض کیا: ”مَیں علیحدگی میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں“۔ آپ چلنے پھرنے سے قاصر تھے اس لیے ہمیں باہر بھیج دیا تاکہ اس شخص کی خواہش کی تکمیل ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے بلا کر ارشاد فرمایا کہ اس سائل کو یکصد روپیہ دے دیا جائے۔ مَیں نے حکم کی تعمیل تو کر دی، لیکن آپ کی دریا دلی اور فیاضی سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ پر فرزدق کا یہ شعر پُوری طرح صادق آتا تھا:

ماقال لاقط اِلافی تشھدہ
لولا التشھد کانت لاؤہ نعم

سادگی اور انکسار پسندی

جناب عبد الحمید صدیقی مرحوم و مغفور سادگی پسند اور منکسر المزاج انسان تھے۔ شہرت اور عظمت کے انتہائی بلند رُتبہ تک رسائی حاصل کرنے کے باوجود کبھی لاف زنی نہیں کرتے تھے بلکہ اس اعزاز کو خدا کی مہربانی سمجھتے تھے۔ وہ مردِ مومن تھے۔ اس لیے آپ کی ذات تکبّر اور نخوت کی آلائشوں سے بالکل مبرّا تھی۔ آپ سادہ لیکن صاف ستھرا لباس زیبِ تن کرتے۔ آپ نیا جُوتا اور ایسا زرق برق لباس پہننے سے اجتناب کرتے جس سے تکبّر کے آثار ہویدا ہوں۔ آپ چلتے ہُوئے میانہ روی اختیار کرتے اور

زمین پر اس قدر آہستہ آہستہ قدم رکھتے کہ پاؤں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا کہ آپ قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح عمل پیرا ہیں:

عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ﴿ (رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں)

آپ ہر شخص کو خندہ پیشانی سے ملتے اور آپ کا یہ انداز دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔ آپ کسی سے مصروفِ تکلّم ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ آپ ہدایات کے پھول بکھیر رہے ہیں۔ آپ کی مجلس اس قدر روح پرور ہوتی کہ مجلس چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ آپ کی گفتگو میں اس قدر حلاوت تھی کہ سُن کر قلب و رُوح کو تسکین ہوتی۔ یہ ہر دلعزیزی اور محبوبیت تعلق مع اللہ کا ثمرہ تھا۔ متاعِ دُنیا سے بے نیازی، دارِ فانی سے بیزاری اور سامانِ آخرت کی تیاری آپ کے خصوصی وصف تھے۔ جب آپ بات کرتے تو سامعین علوم و معارف کے موتیوں میں دامن سمیٹنے کی کوشش کرتے۔ دُنیا کی گوناگوں نعمتیں میسّر ہونے کے باوجود آپ جاہ و جلال کا مظاہرہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ آپ بستر بچھائے بغیر چارپائی پر محوِ استراحت ہوتے۔ بسا اوقات زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹ جاتے۔ آپ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:

"میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح سادہ طرزِ زندگی اپنانا چاہتا ہوں کہ بستی سے دُور ایک کُٹیا بنا لوں اور وہیں رہائش اختیار کر لوں۔"

آپ کبھی اپنی ذات کو فائق اور بالاتر سمجھ کر ترجیح نہیں دیتے تھے بلکہ اکثر یہ دُعا کرتے تھے:

"اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً وفی اعین الناسِ کبیراً"۔

اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دے۔ (حدیث نبویؐ)

آپ کی حقیقی عظمت کا راز اسی وصف میں پنہاں تھا کہ لوگوں کی نگاہ میں عظیم ہونے کے باوجود آپ اپنی نگاہ میں ہمیشہ چھوٹے رہے اور عاجزی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اسی خوبی نے آپ کو دنیا کی نگاہوں میں معزز کیا اور خدا

کا جلیس بنا دیا۔

زُہد و تقویٰ

بعض لوگ علم و فضل میں اعلیٰ وارفع مقام کے حامل ہوتے ہیں اور دُنیا ان کی علمی فضیلت کا اعتراف کرتی ہے، لیکن عبادتِ الٰہی کے معاملہ میں وہ تساہل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جناب عبدالحمید صدیقی نور اللہ مرقدہٗ کے نزدیک عبادت سب سے مقدم فرض تھا اور زندگی کے آخری لمحہ تک اس سے غافل نہیں ہُوئے۔ آپ باجماعت نماز پڑھتے اور اگر کسی عُذر کی وجہ سے مسجد میں بروقت نہ پہنچ سکتے تو آپ کو سخت ملال ہوتا۔ آپ شدید علالت کی حالت میں بھی تیمم کر کے باقاعدہ نماز پڑھتے رہے اور ہر نماز کے بعد پیکرِ خضوع و خشوع بن جاتے تھے۔ چونکہ آپ نے بار بار "حصنِ حصین" پڑھی ہوئی تھی اس لیے آپ کو ہر موقع اور محل کی مسنون دُعائیں زبانی یاد تھیں۔ آپ انہیں برابر پڑھتے رہتے تھے۔ یقین ہے کہ اللہ غفور الرحیم نے ان کی دعوات کو شرفِ قبولیت سے نوازا ہوگا اور وہ عظیم اجر و ثواب سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

برادرِ محترم تلاوتِ قرآن پاک سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں طرزِ ادا، سوز و گداز اور جذب و استغراق دائرہ بیان سے باہر ہے۔ آپ روزے رکھنے میں بڑے باہمّت اور موّفق تھے۔ ماہِ صیام میں روزے رکھنے کے علاوہ نفلی روزے بڑے ذوق و شوق سے رکھتے تھے۔ آپ بڑے رقیق القلب تھے۔ آپ جب کبھی تلاوتِ قرآن پاک سُنتے تو خشیتِ الٰہی کی وجہ سے آپ کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلتا اور آپ قرآن پاک کی اس آیت کی مجسّم تصویر بن جاتے:

وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا۔

وہ (مومن) ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں۔ گریہ و زاری کرتے ہُوئے اور قرآن ان کا خشوع بڑھا دیتا ہے۔ (سورۃ الاسراء: ۱۰۹)

عِلم سے شغف

جناب عبدالحمید صدیقیؒ علم کا گراں مایہ خزینہ اور بیش بہا گنجینہ تھے۔ مطالعہ کتب آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ گھنٹوں مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔ آپ کا ذاتی کُتب خانہ تقریباً دس ہزار مُستند اور معیاری کتب پر مشتمل ہے۔ بیشتر کتابوں کے اقتباسات آپ کو زبانی یاد تھے۔ کثرتِ معلومات۔ استحضار اور وسعت نظری کے اعتبار سے آپ علمی خزانہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ قرآنِ پاک کے اسرار و رموز کو جاننے اور ظاہر کرنے والے تھے۔ آپ سراپا علم تھے۔ علم آپ کی ذات میں اس طرح سرایت کر چکا تھا جیسے پھُول کے اندر رنگ و بو اور ہیرے کے اندر چمک دمک موجود ہوتی ہے۔

آپ کی بیشتر تصانیف انگریزی میں ہیں جو انگریزی ادب کا شاہکار ہیں۔ آپ کا اندازِ تحریر دیکھ کر اہل زبان بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی تصانیف اور تالیفات میں اچھوتا اور منفرد اسلوب تحریر اپنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلاغت اور فصاحت کی دولت سے مالامال کیا تھا۔ آپ کی تصانیف کے تراجم دُنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ نے ان کتابوں میں اپنی خداداد ذہانت سے علم کے موتی بکھیرے ہیں۔ آپ نے قرآن اور حدیث کے معانی اور مطالب کو علمی انداز میں عقلی دلائل سے مبرہن کر کے پیش کیا ہے۔ انگریزی کے علاوہ آپ اُردو کے بھی صاحبِ طرز ادیب تھے۔ عربی زبان پر آپ کو پُوری طرح عبور حاصل تھا۔

مہمان نوازی

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور بے حد متواضع اور مہمان نواز تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مہمان نوازی آپ کی طبیعتِ ثانیہ اور رُوحانی غذا ہے۔ مہمانوں

کا بے حد احترام کرتے اور ان کے اعزاز و تکریم میں بچھے جاتے تھے۔ علمی مشاغل کے باوجود مہمان کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ حسب استطاعت اچھے کھانے تیار کرواتے اور مہمانوں کو پیار سے کھلاتے۔ ان کے آرام اور آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھتے اور اپنا قیمتی وقت ان کے ساتھ گزارتے۔

حِلم و بُردباری

قرآن پاک کے مطابق مومن کی صفات میں سے ایک وصف یہ ہے کہ وہ حلیم الطبع اور متحمل مزاج ہوتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (سورۃ آلِ عمران : ۱۳۴)

اور وہ غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں
اور اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جناب عبدالحمید صدیقیؒ نہایت حلیم الطبع تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا آپ کی طبیعت میں غصہ کا شائبہ تک نہیں۔ زندگی بھر میں نے کبھی آپ کی جبیں پر غصہ کی وجہ سے سلوٹوں کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اگر کوئی بات آپ کے مزاج پر گراں گزرتی تو آپ زبردست تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے اور کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہوں۔ آپ اختلافات کو بھی حتی الامکان ناخنِ تدبیر سے سُلجھانے کی کوشش کرتے اور کسی صورت بھی آپے سے باہر نہ ہوتے۔ مصائب کی آندھیاں آئیں تو آپ نے صبر و تحمل سے ان کا رُخ موڑ دیا۔ رعد گرجی تو بے نیازی سے مسکرا دیئے۔ کبھی بھی آپ کے پائے استقلال میں ذرہ بھر بھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ بقول اقبال ؎

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

دیانتداری

جناب عبدالحمید صدیقی نوراللہ مرقدہٗ بے حد دیانتدار تھے۔ لین دین کے معاملہ میں ایک ایک پیسہ کا باقاعدہ حساب رکھتے اور بعض مخیر حضرات آپ کی وساطت سے نادار طلبہ، مساکین اور بیوہ عورتوں کو وظائف دیتے تھے۔ آپ اس رقم کا جائز مصرف کرتے اور اس کی تقسیم میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے۔ آپ کے نزدیک دولت ڈھلتی چھاؤں کی طرح تھی اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے طفیل دُنیا اور اہلِ دنیا کو آپ کی نظر میں ہیچ کر رکھا تھا۔ آپ کے پاس اور تو سب کچھ تھا لیکن دُنیا طلبی کی ان کے ہاں کوئی مدّ نہ تھی۔

نظافت اور نفاست

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم و مغفور کو اللہ تعالیٰ نے نظافت اور نفاست پسندی کا پاکیزہ ذوق عطا کیا ہوا تھا۔ آپ کا ماحول، تہذیب، کردار اور سلیقہ مندی کی سبق آموزی میں ایک ایسی مستقل درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا جس میں رہ کر غیر مہذب انسان مہذب بننے پر مجبور ہو جاتا۔ آپ ہمیشہ سفید براق لباس پہنتے اور سالہا سال تک آپ کا مستعمل لباس بھی بالکل بے داغ اور نیا معلوم ہوتا تھا۔ آپ اتنے خوش ذوق تھا کہ ذرا سی نجاست طبیعت پر بوجھ اور ملال کا باعث بن جاتی اور جب تک صاف نہ کر لیتے طبیعت کو چین نہیں آتا تھا۔ آپ کے ذاتی کُتب خانہ میں تقریباً دس ہزار نادر کُتب موجود ہیں جن میں سے بیشتر کُتب کا آپ نے ضرور مطالعہ کیا ہوگا لیکن کسی کتاب کا ورق بار بار استعمال ہونے کی وجہ سے خراب یا بوسیدہ نظر نہیں آتا۔ کتابوں اور روزمرہ استعمال ہونے والی اشیائ کے لیے جگہ کی تخصیص آپ کی شائستہ مزاجی کا بیّن ثبوت تھا۔ مطالعہ کرتے وقت اگر آپ کتابت یا طباعت کی کوئی غلطی دیکھتے تو حاشیہ پر بڑی نفاست سے اس کی تصحیح کر دیا کرتے تھے جب

آپ کتاب میں کوئی ایسی بات پڑھتے جو صریحاً گمراہ کُن ہوتی تو کسی مناسب جگہ پر اس کی تغلیط تحریر کر دیتے تاکہ قاری متنبہ ہو جائے، لیکن یہ کام کرتے ہُوئے بھی آپ کتاب کی نفاست پر حرف نہ آنے دیتے۔

حیا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:
اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (حیا ایمان کا ایک عظیم شعبہ ہے) (بخاری)
جناب عبدالحمید صدّیقی حضورؐ کے اس فرمان پر پوری طرح عمل کرتے تھے۔ وہ مجسمۂ شرم و حیا تھے۔ آداب حجاب اس قدر ملحوظ رکھتے کہ غسل کے وقت غسل خانے میں بھی زیر جامہ سے علیٰحدہ ہونا طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ راہ چلتے نگاہیں نیچی رکھتے اور ہمیشہ ایسی بات کرنے سے گریز کرتے جس سے حریم شرم و حیا کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ برادر محترم کے اوصاف حمیدہ کا تفصیل سے تذکرہ کرنا تو میری بساط سے باہر ہے۔ البتہ اُن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جود و سخا کے معاملے میں حاتم، علم کے سلسلے میں حضرت علیؓ اور حیا کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ اُن کے لیے بہترین مثال تھے۔ جہاں تک مہمان نوازی اور صبر و استقامت کا تعلق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ایوبؑ اُن کے لیے اعلیٰ معیار تھے اور سیرت باطنی میں وہ حضرت یحییٰؑ کو اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے۔

علالت اور رحلت

یہ عالمِ آب و گِل مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے بندے کے صبر کا امتحان لینے کے لیے اسے آزمائشوں میں ڈال دیتا ہے۔ اگر وہ کامیابی سے ہر مصیبت پر صابر اور شاکر رہے اور حرفِ شکایت بھی لب پر نہ لائے تو خدا اس پر بے پایاں رحمتوں اور برکات

کا نزول فرماتا ہے۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّصِبْ مِنْهُ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے مصیبت میں مُبتلا کر دیتے ہیں۔ (بخاری)

اور جب انسان مصائب و آلام کا شکار ہونے کے باوجود صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو خدا اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور اسے اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دینے کے علاوہ لامحدود انعامات سے نوازتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (بقرہ: ۱۵۳)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (سورۃ الزمر: ۱۰)

بے شک صبر کرنے والوں کو بے حد و حساب صِلہ ملے گا۔

جناب عبدالحمید صدیقی قدس سرہٗ پر دو دفعہ فالج کا حملہ ہوا، لیکن آپ نے دورانِ علالت زبردست صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ شاید خداوندِ قدوس انہیں آزمائش میں ڈال کر کندن بنانا چاہتا تھا۔ اور پھر اپنے محبوب بندے کو سایۂ رحمت میں جگہ دینے کے لیے بیتاب تھا۔ برادرِ محترم بیماری کی حالت میں بھی یادِ خدا سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں ہوئے تھے۔ خضوع و خشوع سے نماز پڑھتے اور کثرت سے درود شریف کا وِرد کرتے تھے۔ رسولِ خدا سے عشق و محبت کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ کے ذکر سے آپ کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ڈرنے والا دل اور رونے والی آنکھ عطا کی تھی۔ آپ توبہ و انابت اور خوف و خشیت سے سرشار تھے۔ جو شخص بھی عیادت کے لیے آتا آپ اس سے دُعائے خیر کرنے کی

درخواست کرتے تھے کیونکہ آپ کو یقین کامل تھا کہ دواؤں سے نہیں بلکہ لوگوں کی دعاؤں سے صحت یاب ہوں گے۔ چنانچہ یہی ہُوا اور آپ دونوں مرتبہ اس مہلک مرض کے اثرات سے بچ گئے۔ آپ بیماری کی حالت میں معمول سے زیادہ سخاوت کرتے تھے اور کبھی بھی تکالیف کی یورش آپ کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ البتہ یہ فکر کبھی کبھی آپ کے لیے سوہانِ رُوح بن جاتی تھی کہ کہیں تصنیف و تالیف کے ذریعے دین کی خدمت کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ فالج کے دُوسرے حملہ سے جانبر ہونے کے بعد پھر لاہور جانے کا پروگرام بنایا تاکہ قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا کام شروع کیا جا سکے۔ اہلِ وعیال اور عزیز و اقارب نے پروگرام ملتوی کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ کے آہنی عزائم کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکتی تھی۔ اہلِ خانہ تو آپ کے اس فیصلہ کے باعث پریشان تھے لیکن موت کا فرشتہ آپ کا منتظر تھا اور قُدرت اس مردِ مومن کی استقامت کی داد دے رہی تھی۔ آپ سولہ اپریل ۱۹۷۸ء کی صبح کو بیدار ہُوئے، سفر کی تیاری کی۔ گھر کے در و دیوار پر حسرت سے نگاہ ڈالی، بچّوں کو خوب پیار کیا اور لاہور کی جانب حسبِ معمول روانہ ہُوئے۔ چونکہ آپ پنجاب پبلک لائبریری کے ایک وسیع و عریض کمرہ میں بیٹھ کر سالہا سال سے کام کیا کرتے تھے۔ اس لیے آپ سب سے پہلے وہاں پہنچے، کچھ دیر آرام کیا اور احباب سے گرمجوشی سے ملتے رہے۔ بعد ازاں اپنے چھوٹے بھائی پروفیسر محمد اکرام کے ہاں تشریف لے گئے۔ آئندہ روز بھی کام کرنے کے لیے لائبریری میں گئے اور ضروری کُتب کو قرینہ سے رکھا۔ سترہ اپریل کو آپ نے تفسیر کے چند صفحات تحریر کیے اور اپنے برادرِ نسبتی کے شدید اصرار پر اس رات اس کے مہمان بن گئے۔ یہ رات آپ کی زندگی کی آخری رات ثابت ہُوئی۔ رات کے پچھلے پہر دل کا عارضہ لاحق ہُوا۔ دل کی بے چینی کو کم کرنے کے لیے نوافل پڑھنے کا عزم کیا، اُٹھے اور وضو کیا، مگر جسم نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، ہمّت جواب دے گئی۔ کچھ عرصہ بعد

اذان ہوئی ۔ اللہ اکبر کی صدا سنتے ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۔

جناب عبدالحمید صدیقیؒ زندگی کے آخری لمحہ تک ضلالت اور گمراہی کی تاریکیوں کے خلاف جہاد کرتے رہے ۔ بلاشبہ آپ مجاہد تھے ۔ اللہ کی راہ میں جسم و جان کا نذرانہ پیش کرنے والے انسان عنداللہ شہداء کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں ۔ ان کو اللہ تعٰ دنیا کی ناقص زندگی کے عوض حیاتِ جاوداں عطا کرتا ہے اور قرآن کے اس ارشاد بَلْ اَحْیَاءٌ وَّ لٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ کے مطابق انہیں مردہ کہنا ان کے شایانِ شان نہیں ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جب منبع علوم و معارف، عجز و انکسار کا نمونہ ، صبر و تحمل کی روح ، خلوص کا مجسمہ، حسنِ خلق کی زندہ تصویر اور آداب و خلوص کا پیکر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو تمام کائنات سوگ میں ڈوب گئی ۔ عقیدتمندوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی سبیلیں بہہ رہی تھیں اور زبان پر آہیں تھیں ۔ ہر طرف گریہ و نالہ کی دلخراش آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ ہر شخص مجسمۂ حیرت اور سراپا غم و الم بنا ہوا تھا ۔ باہمی مشورہ کے بعد اس جسدِ مبارک کی تدفین کے لیے ہمارے آبائی گاؤں کے قبرستان کا انتخاب کیا گیا ۔ آپ کی نعش مبارک وہاں پہنچائی گئی ۔ ریڈیو پر یہ روح فرسا خبر سنتے ہی ملک کے گوشہ گوشہ سے ہزاروں انسانوں کا ہجوم امڈ آیا ۔ تدفین سے قبل جب عقیدتمندوں، واحقین اور اقرباء کو آخری دیدار کا موقع فراہم کیا گیا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ انتہائی سکون کے عالم میں آرام فرما رہے ہیں ۔ حسین و جمیل چہرہ آب و تاب اور نور و سرور کے ساتھ ناظرین کے سامنے تھا ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

کچھ دیر کے بعد سوگواروں کا بے پناہ ہجوم اس ذات قدسی صفات کو آخری آرامگاہ

کی طرف لے چلا۔ میاں طفیل محمد صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپ کو اپنے اباؤاجداد کے پہلو میں دفن کردیا۔

مرقد پہ تیرے رحمتِ حق کا نزول ہو
حامی ترا خدا اور خدا کا رسولؐ ہو

اے اللہ! ہم ضعیف و ناتواں ہیں۔ ہمیں صبرِ جمیل عطا فرما۔ خدارا ہمارے برادرِ محترم کا مسکن و ماویٰ جنت الفردوس کو بنا اور ان کے ساتھ ایسا حسنِ سلوک کر جو تیرے وصف ارحم الراحمین کے شایانِ شان ہو۔ اے اللہ! میں دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ میرے شفیق بھائی کی پاک رُوح کو اعلیٰ علیین میں پہنچا کر اکرام و اعزاز سے نواز دے۔

اے اللہ! میرے پارسا بھائی کو آخرت میں ارفع درجات نصیب فرما۔ ان کے اہلِ و عیال کو برکاتِ سماوی سے مالامال فرما اور ہمیں ان کے مشن کو کامیابی سے سرفراز کرنے کی ہمّت اور توفیق عطا فرما۔

وصلے اللہ تعالےٰ علےٰ خیر خلقہٖ محمد و آل وصحبہٖ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

وہ شمعِ فروزاں جس نے مسلسل ۲۶ سال تک ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی محفل "اشاراتؔ[1]" کو روشن رکھا، سال ڈیڑھ سال ٹمٹمانے کے بعد آخر گل ہوگئی ؎

ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

گوجرانوالہ سے چار پانچ میل شمال کی جانب بستی فیروز والا میں، ۱۸ اپریل کو ساڑھے چار بجے شام نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کی سات صفوں کے سامنے اس شخص کی میت رکھی تھی جسے پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے علم وایمان کا یہ آفتاب قبر کی گہرائی میں غروب ہوگیا۔ اب وہاں صرف مٹی کی ایک ڈھیری یہ بتانے کے لیے موجود ہے کہ یہاں محوِ خواب ہے وہ شخص جس نے کتنی ہی خوابیدہ روحوں کو جگایا ہوگا۔

میرے ذہن میں یکایک قرآن کی وہ دردناک مگر بشارت سے لبریز آیت گونجنے لگی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر جیسے نفاست پسند نوجوان کی نعشِ مبارک کو خاک وخون میں پڑے دیکھ کر پڑھا تھا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (سورہ الاحزاب ۲۳)

ایمان والوں میں ایسے مردانِ کار شامل ہیں جنہوں نے اللہ سے باندھے ہوئے پیمان کو سچ کر دکھایا۔ پس اُن میں سے کوئی وہ ہے جس نے اپنی ذمہ داری

۱۔ ماہنامہ ترجمان القرآن کے اداریے جو کہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم لکھتے تھے۔

کا (آخری سانس تک) حق ادا کر دیا۔ اور کوئی وہ ہے جو (ادائے فرض کے لمحۂ تکمیل کا) انتظار کر رہا ہے۔

ایفائے عہد تو جیتے جی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے سارے ہی خوش نصیب مسلمان کر رہے تھے، مگر حق تو ادا جبھی ہو سکتا ہے کہ آدمی آخری لمحے تک ایمان کے تقاضوں کو پورا کر دکھائے۔ درمیان میں قدم قدم پر صدہا رہزن، ہزار ہا چور جذبے اور کید شیطانی کے صد ہزار پھندے حائل ہیں جن کی وجہ سے کتنے ہی علم و تقویٰ کے خزانہ بردار ایک ذرا سے ہیر پھیر میں پڑ کر عمر بھر کی کمائی لٹوا بیٹھتے ہیں۔ کردار کی اونچی چوٹیوں تک ہانپ ہانپ کر برسوں کی محنت سے پہنچنے والے لوگ دل کے کسی کھوٹ، نگاہ کی کسی خیانت، کمائی میں حرام کی آمیزش، ذہن میں کبر و کینہ کی کسی لہر اور معاملات میں ظلم کے کسی اقدام کی وجہ سے پل میں نیچے پٹخ دیئے جاتے ہیں، بلکہ بعض سے تو سطح زمین پر ٹکنے کا اعزاز بھی چھن جاتا ہے، اور وہ سیدھے اسفل السافلین میں پہنچ جاتے ہیں۔ اللّٰھم احفظنا جمیعاً۔

ہمارے بھائی عبدالحمید صدیقی خدا سے باندھے ہوئے پیمانِ وفا کو تادمِ آخر نبھا گئے، اور انہوں نے تقاضائے ایمان سے ذرا انحراف نہیں کیا:

وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (سورۃ الاحزاب ۲۳)۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے وہ خدمات انجام دیں جن سے نہ صرف آج ہم استفادہ کر رہے ہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لاکھوں افراد کو اُن سے حصہ ملے گا۔ مرحوم کے قلم سے رقم شدہ متعدد کتابیں سیرت، تاریخ اسلام، فلسفۂ تاریخ، تعلیم اور مغربی تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر انگریزی اور اُردو میں موجود ہیں۔ مشکوٰۃ اور مسلم شریف کے تراجم انگریزی میں کیے۔ انگریزی زبان میں انہوں نے قرآن کا ترجمہ مع تفسیر و حواشی کے تیار کرنا شروع کیا اور غالباً بارہ پاروں تک کا کام ہو چکا تھا۔ (جن میں سے آٹھ پارے شائع ہو چکے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ارضی زندگی کے دورِ امتحان کو ختم کر دیا۔ علاوہ ازیں بہت سے مضامین کا انگریزی زبان سے ترجمہ کیا۔ بے شمار کتابوں پر تبصرے لکھے، ترجمان القرآن کے سینکڑوں "اشارات" خوبصورت

علمی انداز میں لکھتے ہوئے دینی حقائق کی روشنی میں سیاسی احوال کا ناقدانہ تجزیہ کیا۔ یہ ایک مستقل مدرسہ تھا۔ جس کے تحت ہر ماہ ہزاروں قارئین کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔ رفیق محترم صدیقی اپنی کتابوں کے پیکر میں تادیر لوگوں کے سامنے رہیں گے۔
غلبۂ حق کے لیے ان کی کاوشوں کو خداوند کریم قبول فرمائے اور ان کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر میں غیر معمولی اثر بھر دے۔

میرے سامنے بہت سے احباب نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اُن کی علمی خدمات کا ذکر کیا، مگر میری نگاہ میں ان خدمات سے بڑھ کر ایک اور چیز ہے جو مرحوم کی پیشانی کو آخرت میں نور پاش بنا دے گی۔

وہ تحریکِ اسلامی کے اخلاقی تقاضوں کے مطابق انسانیت کا پر کشش نمونہ تھے۔ میں خاص طور پر اس پہلو کا ذکر اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کہیں ہنگامہ ہائے نو بہ نو سے گزرتے ہوئے اس سے غافل نہ ہو جائیں۔ میرے نزدیک اسلامی شعور کے تحت کسی شخص میں سب سے پہلے دیکھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے کے لیے یہی پہلو ہے کہ اس نے رفیقوں اور رقیبوں کے ساتھ مختلف معاملات نبھاتے ہوئے پیچ در پیچ رابطوں کے جنگل کو کس طرح عبور کیا۔

تحریکِ اسلامی کا اگر کوئی تصوّف ہو سکتا ہے تو مرحوم اس کا بہترین نمونہ تھے۔ احباب کے لیے محبت کیش، اغیار کے لیے بے ضرر، مفاد و عناد کے چکروں سے مجتنب، رشک و حسد اور کینہ و کد سے محفوظ، کبر و خود بینی سے دُور، خُوگر سکوت اور انکسار پسند ______ مگر ان اوصاف کا ایک ایسا صحت مند نمونہ جو فکری دائرے میں باطل کے خلاف بغیر کسی مداہنت و رعایت کے مصروفِ پیکار تھا۔ نہ اس نے ترکِ ستیز کی راہ اختیار کی، نہ جمود و یاس کی پرچھائیں اپنے اُوپر پڑنے دی۔

سچے مسلمان کا مسلک خدا کی عبادت کے ساتھ اس کے بندوں کی خدمت سے عبارت ہے۔ ان کے سلوکِ خدمت کے مظاہر کئی تھے۔ اپنے ذوی القربیٰ میں سے کسی کو بھی مالی تکلیف کا سامنا ہوتا تو وہ اس تکلیف کو اپنے کھاتے میں ڈال

لیتے۔ رشتہ داروں سے باہر بھی بعض اہلِ احتیاج کے لیے اُنھوں نے چھوٹی چھوٹی رقوم بہ طور وظیفہ مقرر کر رکھی تھیں۔

مرنجان مرنج ہونے کا محاورہ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ کم سے کم میرے علم میں ایسا نہیں ہے کہ کسی شخص سے ان کی تناتنی یا رنجش چل رہی ہو، کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے اُنھوں نے کبھی سوچا تک بھی ہو یا کسی کے لیے ایسے ناخوشگوار جذبات کا اظہار کیا ہو یا ایسے اذیت ناک الفاظ استعمال کیے ہوں کہ ان کے نتیجے وہ چیز مستقلاً پیدا ہو جائے جسے غِلّ کہتے ہیں، اور جو بسا اوقات مر جانے کے بعد بھی نہیں چھوڑتی۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ اہلِ ایمان صالحین کو جنّت میں لیا جائے گا تو ان کے سینوں میں اگر کوئی غلط فہمی یا احساسِ اذیت یا منافرت وغیرہ کا شائبہ ہوگا تو اُسے صاف کر دیا جائے گا۔ (وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ۔ (سورہ الاعراف ۴۳، الحجر ۴۷)۔

بہ حیثیت انسان مرحوم رفیق کی بڑائی کی ایک علامت یہ ہے کہ مجھے جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو چند لمحوں کے لیے ان کی محبت و عنایت کی وجہ سے اپنے اندر عزت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ بعض لوگوں کے پاس آدمی بیٹھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ چھوٹا ہو گیا ہے، بعض کی ہم نشینی سے برابری کا تصور ملتا ہے۔ خاص خاص لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگرچہ بڑے وہ خود ہوتے ہیں، مگر وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں میں برتری کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ بڑا ہوتے ہوئے بھی اپنے رویے سے چھوٹے چھوٹے ہم نشینوں کو بڑا بنا دینا، یہ ایک ایسا مقام ہے جو شاذو نادر کچھ لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ عبدالحمید صدیقی اسی مقام پر فائز تھے۔

انسان اور انسان کے درمیان آج اتنی دیواریں کھڑی ہیں کہ لوگ مل بیٹھ کر بھی جدا رہتے ہیں۔ ہر شخص اپنی کچھ دیواریں ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ دیواریں دولت اور سٹیٹس اور معیارِ زندگی اور باہمی کشاکش اور بے اعتمادی اور حقیقی محبت کے بجائے محبت کی ایکٹنگ اور ڈیل کارنیگی ازم اور تعلقات کو مطلب برآری کا ذریعہ

بنانے کے مسالے سے تعمیر ہوتی ہیں۔ یہ غیر مرئی دیواریں ان دوستیوں اور تعلقات اور ملاقاتوں کو اس اثر سے خالی رکھتی ہیں کہ دو یا زیادہ افراد باہم بھائی بھائی بن سکیں۔ خدا مغفرت سے نوازے پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو جو اوّلین کلمۂ خطاب "بھائی جان" کہہ کر ان دیواروں کو کالعدم کر دیتے تھے۔ اور ان کا لہجہ بے حد ملائم اور غیر مصنوعی ہوتا۔

ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں انشاء اللہ علمی خدمات بھی انجام پائیں گی۔ کتابیں مرتب ہوتی رہیں گی، سیاسی معرکے جاری رہیں گے۔ مگر عبدالحمید صدیقی جیسا دوسرا آدمی مرحوم کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے ہمیں میسّر ہو گا یا نہیں —— کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تحریکِ اسلامی کی قوت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہمارے اندر سے اخلاقی جگمگاہٹ رکھنے والے ایسے انسان مسلسل اُبھرتے رہیں جیسے عبدالحمید صدیقی تھے اور اُن کو اوّل درجے کی قدر و قیمت حاصل ہو۔ اگر یہ نہ ہوا تو پھر اگر فرمانروائی بھی مل جائے تو بھی تحریکِ اسلامی کے اصل مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔

مرحوم کی ایک خوبی اُن کا حلم اور صبر تھا اور یہ جوہر اتنا رچا بسا ہوا تھا کہ چال بھی دھیمی تھی۔ (یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْناً۔ (سورۂ الفرقان۔ ۶۳) اور قال میں بھی ایسا ٹھہراؤ کہ "نرم دم گفتگو" کا اطلاق ہوتا تھا۔ آواز بھی متوسط سطح سے کچھ کم ہی رہتی۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (سورۂ لقمان ۱۹) خاص طور پر آدمی کے صبر و حلم کی جانچ مرحلۂ اختلاف میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنی "انا" کے دباؤ سے بھی بات بات میں اختلاف کرتے ہیں۔ اختلاف کو زور سے بیان کرتے ہیں، لفظوں میں بھی زور، لہجے اور آواز میں بھی زور۔ پھر چاہتے ہیں کہ لازماً اُن کی بات چلے، اور بات چل جائے تو ان میں فتح مندی کا احساس اُبھرتا ہے۔ یہی پگڈنڈی ہے جو مناظرے اور مجادلے کی وادیوں تک لے جاتی ہے۔ ہمارے مرحوم بھائی اس معاملے میں بڑی مختلف ساخت کے تھے۔ اوّل تو کثرتِ اختلاف کا مرض نہ تھا۔

ہر چھوٹے موٹے اختلاف کو اس قسم کے موقعوں پر میدان میں اُچھال دینے کی عادت نہ تھی، جہاں ضروری ہوتا وہاں اپنی رائے کے طور پر اختلاف کو عام لہجے میں مختصراً بیان کر دیتے اور اُن کے جذبات کی فوجیں حرکت میں نہ آتیں۔ ان کی کوشش یہ نہ ہوتی کہ دوسروں سے کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوانا ہے۔ کسی نے کچھ سمجھ لیا تو بہتر، نہیں تو خوبصورتی سے بات کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیا۔

آخر میں ہم جدا ہونے والی مبارک روح سے کہتے ہوئے کہ "ارجعی الیٰ ربک راضیۃً مرضیہ" خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بچھڑ جانے والے پیارے بھائی عبدالحمید صدیقی کو صدیقین و شہداء اور صالحین کے اُس گروہ میں شامل کرے جو انبیاء کے گرد جمع ہے۔ خدا اس نیک نہاد بندے کی قبر کو کشادہ اور منور کرے، خدا اسے شفاعتِ پیغمبرِ آخرالزماںؐ کی برکت سے مغفرت بغیر حساب نصیب کرے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے کام کو اس کے لیے صدقۂ جاریہ بنا کر ہر آن اس کے اعمال میں ثواب کا اضافہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اُس کی تحریروں کی برکت سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایمان باعمل کی نعمت سے نوازے۔ وہ مرحوم کی وفات سے تحریکِ اسلامی میں پیدا ہونے والے خلا کو بہترین شکل میں پورا کرے۔ وہ ہمیں اور جملہ رفقائے تحریک کو توفیق دے کہ ہم ان کی تحریروں اور اُن کی عملی مثال سے استفادہ کر کے بہتر مرتبے کے انسان بنیں۔ خدائے رحمٰن و رحیم صدیقی مرحوم کے لواحقین کے لیے خود بہترین سہارا بنے اور اُن کو اور ان کے خاندان بھر کے اعزہ و اقربا کو اُن کے سے ایمان و علم اور اُن کے سے کردار و تقویٰ کا وارث بنائے۔ آمین!

(نعیم صدیقی)

ایک عظیم اِنسان اُٹھ گیا

پنجاب پبلک لائبریری کے گوشے میں ایک مردِ درویش کا بسیرا تھا۔ کتابوں کے ڈھیر میں تہذیب و ثقافت کا اک سوتا پھوٹتا تھا۔ سادہ سی میز کے گرد اک عظیم انسان کی مجلس آرائی تھی۔ "رفعت سلطانہ سیکشن" کے ایک گوشے میں علم و دانش کی اک شمع جلتی تھی۔ کام میں منہمک اک بے نیاز قلندر کی دنیا آباد تھی۔ انسانیت کا مُسکراتا چہرہ روشن تھا۔ شیریں زباں میں تاثرات کا ایک سمندر موجزن تھا۔ طالبانِ علم و ادب اور عاشقانِ قرآن و حدیث ہر وقت جمع رہتے تھے۔ صبح سے شام تک اِک محفل جمی ہوتی تھی۔

آہ! وہ مردِ درویش، وہ منبع تہذیب و ثقافت، وہ مرجع طالبانِ حقیقت، وہ شمع انوارِ علم، وہ بحرِ ادب و معانی چند روز ہوئے اپنوں اور غیروں سبھی کو بلکتا چھوڑ گیا۔ لائبریری کا وہ گوشہ ویران ہو گیا۔ کتابوں کے حروف بے معنی ہو گئے۔ وہ مجلسیں اُجڑ گئیں۔ روشنیاں بُجھ گئیں۔ وہ مرکزِ علم و تہذیب بکھر گیا۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی انتقال کر گئے،۔

اس مردِ قلندر کی بارگاہ میں حاضری کا شرف مجھے بھی حاصل تھا۔ اس محفلِ علم و تہذیب کا اک گوشہ میرے لیے بھی تھا۔ اس ادب و معانی کا خزینہ میری بھی دسترس میں تھا۔ مجھے بھی اس عظیم انسان کا نیاز حاصل تھا۔

ہاں! وہ عظیم انسان۔ اب ہم میں نہیں۔ وہ پاک روح اس لعنت گاہِ ہستی سے، اس رزم گاہِ خیر و شر سے، اس کش مکش حق و باطل سے دُور کہیں دُور چلی گئی ہے۔ وہ اس مقام پر چلی گئی ہے، جہاں جانا ہر انسان کا مقدر ہے۔

انسانیت کا مقام لفظوں میں بتانا تو شائد آسان ہے مگر جب اس کی عملی تفسیر کرنے

کی ضرورت پیش آتی تو جرأتیں گنگ ہو جاتیں۔ ایسے میں ہم پروفیسر عبدالحمید صدیقی کا نام لے دیتے تو تفسیر کے تمام مرحلے گویا طے ہو جاتے۔ مقام انسانیت کی تجسیم ہو جاتی۔ عظمتِ انسان کے معانی آشکار ہو جاتے اور شانِ مومن نظر آنے لگتی۔

خدا جانے اسے اپنے نیک بندوں کو دنیا سے جلد بلانے کی کیا جلدی ہوتی ہے۔ اس کی مشیّت وہی جانے ہم حقیر و مجبور بندے اس پر مختار کہاں کہ کسی "انسان" کو جانے سے روک لیں کہ شاید دنیا کو کچھ امن و شانتی کے گوشے نصیب رہیں ؎

جو بادہ کش تھے پرانے اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

آب بقائے دوام کی بات ہے تو اس سے زیادہ بقائے دوام کسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلامیہ کالج کی پروفیسری، ملازمت اور روپیہ تو آنی جانی شے ہے۔ لیکن آمرِ وقت کے سامنے صداقت و حرّیت کا خم ٹھونکے رکھنا ہی صرف انسان کو ابدیت عطا کرتا ہے۔ پروفیسر صاحب کو ایوب خاں نے کیا کیا دھمکیاں نہ دیں۔ کیا کیا رشوتیں پیش نہ ہوئیں۔ ان کا قلم، ان کا ذہن اور ان کی گفتار کی کیا کیا قیمتیں نہ لگیں۔ مگر یہ مردِ آہن اپنے نظریہ، اپنے نصب العین اور اپنے قول کا پکا رہا۔ وہ کسی قیمت پر نہ بک سکا۔ اس نے اسلامیہ کالج کی ملازمت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مگر اسلام کا دامن نہ چھوڑا اور پھر اس مردِ قلندر کی بے نیازی کا کیا کہنا۔ اس کی عظمت کا اندازہ لگایئے کہ پروفیسری چھوٹی تو جماعت اسلامی کے پرچے "ترجمان القرآن" کی ادارت اُن کے سپرد ہوئی۔ معاوضہ کیا طے ہوا، اڑھائی سو روپے! دس پندرہ برس میں مہنگائی اور معاوضے کہاں جا پہنچے۔ مگر اس نے امیر جماعت کے ساتھ بس ایک بار معاوضہ طے کر لیا تو پھر کبھی بڑھانے کا مطالبہ نہ کیا۔ آخر دم تک پرچے کی ادارت کی۔ اور معاوضہ وہی اڑھائی سو روپے! رسالہ بھی وہ تھا جو حکومتِ وقت کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ اس کے اداریے "تاثرات" کے روپ میں دل میں اُتر جانے والے تھے ہلکے ہلکے انداز میں رفتارِ زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھا جاتا تھا۔ حالات و واقعات کا سائنٹیفک تجزیہ ہوتا تھا۔

قرآن وحدیث کی حقانیت کی وضاحت ہوتی تھی۔ اسلام کے ابدی اصولوں کی صداقت پیش کی جاتی تھی۔

اس عظیم انسان کے تبحر علمی کا کیا بیان ہو۔ وہ معیشت دان تھا۔ وہ تاریخ دان تھا۔ وہ عالم قرآن تھا۔ وہ فاضل علم حدیث تھا۔ وہ منبع علوم و تہذیب تھا۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی، کونسی زبان تھی، جس پر اسے اہل زبان کا سا عبور نہ تھا۔

ہائے! کیا کہیں کہ کیا نقصان ہوا۔؟ کتنا خسارہ ہوا! کیا لٹ گیا؟ کہاں لُٹ گیا؟ قافلۂ امت کے کس دستے کا امیر جدا ہو گیا۔ خزینۂ اسلام کا کونسا گوہر کھو گیا؟

تلاش کریں تو کہاں؟ ڈھونڈیں تو کس سمت؟ کوئی کھوج نہیں، کوئی نشان نہیں۔ ہاں مگر اک منزل نما ہمارے سامنے ہے۔ تلاش میں نکلیں گے تو واپس نہ آسکیں گے۔ ڈھونڈنے جائیں گے تو وہیں کے ہو جائیں گے۔

مسلسل یہی سوچتا ہوں کہ موت اتنی ضروری کیوں ہو گئی ہے؟۔ ہر ذی روح مرنے کے لیے ہی کیوں پیدا ہوتی ہے۔؟ زندگی کے طربیہ کے ساتھ، موت کا المیہ! آخر کیوں؟ ہائے! انسان کی تخلیق میں بس ایک یہی خامی ہے کہ وہ مر جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک چلتا بولتا انسان یک لخت خاموش کیوں ہو جاتا ہے؟ اتنے عظیم انسان بھی آخر کیوں رخصت ہو جاتے ہیں۔

صدیقی صاحب بھی رخصت ہو گئے۔ اب ان کی یادوں کے سوا اور رہ بھی کیا گیا ہے؟ اور پھر یادیں بھی یاد کرنے والوں کے ساتھ اُٹھ جائیں گی۔ تب کیا باقی رہ جائے گا؟

سوالات بکھرے ہوئے ہیں اور پروفیسر صاحب کی روح اس میں سے جھانک رہی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ پوچھ رہی ہے، تو پھر کیا ارادے ہیں؟ میری ذات کے لمحات کہاں کہاں بکھیرو گے؟ عظمتِ انسان کی بات کہاں کہاں کرو گے؟ کہ انسان تو عہدوں کی بلندی اور دولت کے مینار سے ناپے جاتے ہیں۔ ہم سے سادہ انسان تو بس خاموشی سے آنکھ میٹ لیتے ہیں ع

اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر (عطش درّانی)

پروفیسر عبدُالحمید صدیقی مرحُوم اپنے بھائی کی نظر میں

یُوں تو اس فانی دنیا میں ہر روز ہزاروں انسان پیدا ہوتے ہیں اور بُری بھلی زندگی گزار کر لقمہ اجل بن جاتے ہیں مگر ایسے انسان کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جن کی زندگی کمالاتِ ظاہری و باطنی ہر دو سے متصف ہو۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

برادرِ محترم پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ سراپا شرافت و عزیمت تھے۔ ان کی زندگی مومنانہ صفات کی ایک عملی تعبیر تھی۔ وہ اپنی حیاتِ مستعار کے ہر لمحہ میں اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ اپنے آپ کو زندگی کے ایسے قالب میں ڈالیں جو کہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہر خادم کے لیے تجویز فرمایا ہے۔ وہ نہ صرف علمی لحاظ سے ایک عظیم مقام رکھتے تھے بلکہ اخلاق و اوصاف حمیدہ کا بھی ایک حسین پیکر تھے۔

بین الاقوامی شہرت کے مالک ہونے کے باوجود تواضع، فروتنی، سادگی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ کوئی اجنبی اُنھیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ آپ قرآن مجید کے مفسّر، احادیث کے شارح اور ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے انقلاب انگیز "اشارات" کے خالق ہیں۔ وہ ان صالحین میں سے تھے جن کے کردار کی ترجمانی اس آیتِ کریمہ سے ہوتی ہے؛

لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَلَا شُكُورًا

برادرِ محترم کی سیرت اور کردار کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو موصوف تقویٰ و زہد، ذہانت و دیانت، فہم و فراست، ایثار و قناعت، صبر و رضا، عزیمت و استقامت، علم و عمل، درس و تدریس غرضیکہ جملہ محاسنِ جلیلہ اور اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے۔ وہ ایک عہد ساز اور تاریخ ساز شخصیت تھے۔ احکامِ اسلام کے پابند اور کتاب و سنت کے والہ و شیدا تھے۔ ان کی پوری زندگی جو اخلاص و للّٰہیت کا نمونہ تھی کتاب و سنت کی اشاعت کے لیے وقف تھی۔ سیاسی طور پر وہ مغربی استعمار کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ جس کی جھلک آپ کی متعدد تصانیف اور تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے آپ عالم، فاضل، مجاہد، جفاکش، جری اور الوالعزم فضلا میں سے تھے۔

برادرِ محترم کا عزم چٹان کی طرح راسخ، دل آئینہ کی طرح شفاف، نگاہ آسمان کی طرح بلند، نظر آفتاب کی طرح روشن، فکر دریاؤں کی طرح رواں، علم سمندر کی طرح وسیع اور عمیق، خرد چراغوں کی طرح منور، فضل اشجار کی طرح سایہ دار اور ثمر ریز، سخن شہد کی طرح شیریں اور دلنواز اور مزاج پھولوں کی طرح نازک و شگفتہ تھا۔

حکمت میں عقدہ کشا، بزم میں صاحبِ علم و کمال، چہرے پر شرافت کی روشنی، آنکھوں میں ایمان کا نور، زبان پر نعرۂ حق، سینے میں انسانیت کا درد، دل میں خوفِ خدا، دوش پر صبر و رضا کی قبا، ہاتھ میں عزیمت و استقامت کا قلم اور پاؤں میں ایسا عزم و ثبات تھا کہ کلمۂ حق کہتے وقت اس مردِ مجاہد کے قدم کبھی نہیں لڑکھڑائے۔ پہلے عالم تھے پھر سراپا علم بن گئے۔

ایک سچے مسلمان کی طرح انھوں نے زندگی کے ہر معاملہ میں اور ہر ادا میں شکل و صورت میں، رفتار و گفتار میں، نشست و برخاست میں اور اخلاق و اعمال میں اسوہ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کی۔ مرحوم کو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہر ادا محبوب تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے گھریلو معاملات و حالات میں

بھی وہی سادگی، قناعت اور زہد اختیار کیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کا خاصہ تھا۔ وہ ساری زندگی نہایت عزیمت و استقامت سے اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف نبرد آزمار ہے۔ صبح تہجّد کے وقت اُٹھ کر اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور دن کو طاغوتی طاقتوں کے سامنے صف آرا۔ مرحوم کی زندگی اس آیت کریمہ کے مصداق تھی۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں، نہ ڈر ہے اُن کو اور نہ وُہ غمگین ہوں گے۔

ملازمت کے بارِ گراں سے سبکدوش ہوئے تو اپنا سارا وقت علمی اور دینی کاموں میں صرف کرنے لگے۔ اُن کا معمول یہ تھا کہ صبح سے شام تک پنجاب پبلک لائبریری میں بیٹھ کر کام کرتے۔ سخت گرمی ہو یا سردی، آندھی ہو یا طوفان بھائی صاحب موسم کی شدّت اور خرابی سے بے نیاز عین وقت پہ لائبریری کھلتے ہی پہنچ جاتے اور جب لائبریری بند ہوتی تو باہر نکلتے اور گھر واپس جا کر بھی رات گئے تک ہمہ تن مصروف کار رہتے۔

بھائی صاحب کی گھریلو اور خارجی زندگی میں کوئی بُعد نہیں تھا۔ اُن کی زندگی بڑی سادہ اور ہر قسم کے تکلفات سے پاک تھی۔ اُن کی اس سادگی کو دیکھ کر صلحائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی۔ گھر میں کسی قسم کا سامانِ آسائش و آرائش موجود نہ تھا۔

امانت و دیانت کا یہ حال تھا کہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے "اشارات" لکھنے کے لیے جو سیاہی کی دوات تھی اس میں سے اپنے ذاتی کاموں کے لیے کبھی بھی کاغذ یا سیاہی استعمال نہ کرتے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت دیتے تھے۔ اپنے ذاتی کاموں اور دیگر لوگوں کے استعمال کے لیے علیحدہ کاغذ اور سیاہی کی دوات رکھی ہوئی تھی۔

قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت ہمیشہ باوضو رہتے اور جب ایک رکوع کا ترجمہ مکمل کر لیتے تو اظہارِ تشکر کے لیے دو نفل ادا فرماتے۔ جن دنوں سیرت نبویؐ لکھ رہے تھے تو رات کو متعدد بار کوئی موزوں فقرہ یاد آتے ہی اُٹھ بیٹھتے اور لکھنے کے لیے بیٹھ جاتے۔ والدہ صاحبہ نے آخر ایک روز پوچھ ہی لیا کہ بیٹے رات گئے تک تم جاگتے رہتے ہو، کیا بات ہے؟ بھائی صاحب والدہ کی بات سن کر مسکرائے اور فرمایا، میں سیرت نبویؐ لکھ رہا ہوں، جوں ہی کوئی مناسب و موزوں فقرہ ذہن میں آتا ہے، رقم کر لیتا ہوں۔

بھائی جان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے عقیدت مندوں کا ان کے پاس تانتا بندھا رہتا تھا۔ کیوں نہ ہوتا وہ اہلِ صفا تھے اور ان کی رفاقت میں وہ چند لمحے گزارنا باعثِ برکت سمجھتے تھے۔ بقول اقبال ؎

صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پُرسوز ہے لالۂ لب آبجو

اُن کے احباب میں ایک حلقہ تو اُن کے جماعتی رفقاء کا تھا۔ دوسرا اسکول اور کالج کے شاگردوں اور اساتذہ کا تھا۔ تیسرا حلقہ ان کے ذاتی دوستوں کا تھا۔ جماعتِ اسلامی کے رفقاء میں سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم سے ان کو حد درجہ عقیدت تھی۔

بھائی صاحب انتہائی مخیّر انسان تھے۔ دوسروں کی مدد کے لیے ہمیشہ اپنی ضروریات کو بھی پسِ پشت ڈال دیتے۔ ان سے امداد حاصل کرنے والوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ جن میں طالب علم، بیوہ عورتیں اور یتیم بچے شامل تھے۔ بھائی صاحب کی سادہ زندگی سے ان کے دوست احباب اکثر یہ تاثر لیتے کہ مرحوم کے مالی وسائل اچھے نہ تھے۔ مگر اصل صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ بھائی صاحب دل کے غنی تھے۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ دوست احباب کی خاطر تواضع اور حاجت مندوں کی حاجت روائی پر خرچ کر ڈالتے۔ بھائی

صاحب نے اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کبھی بھی مالی پریشانی کا ذکر نہیں کیا۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ سے رزق میں وسعت کی دعا مانگتے تاکہ زیادہ سے زیادہ خلقِ خدا کے کام آسکیں۔ ان سے کسی کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا تھا۔ وہ راہ چلتے ہوئے بھی اگر کسی مفلوک الحال کو دیکھ لیتے تو انتہائی مضطرب ہو جاتے اور حتیٰ المقدور اس کی مالی امداد فرماتے۔

بیمار ہوئے تو فالج جیسے موذی مرض کا مداوا بھی مدحِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم میں تلاش کیا۔ چنانچہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مدح میں لکھا ہوا ہے امام بوصیری رحمتہ اللہ علیہ کا "قصیدہ بردہ" اپنی بیماری کے ایام میں اکثر پڑھتے۔ کہتے ہیں کہ امام عبداللہ شرف الدین محمد بن سعد بن معاذ بوصیری رحمتہ اللہ علیہ پر فالج کا حملہ ہُوا۔ اور وہ اطباء کے علاج سے صحت یاب نہ ہو سکے تو انھوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ اقدس میں ایک قصیدہ لکھا۔ خواب میں نبی پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت نصیب ہوئی۔ بارگاہِ رسالت میں باریاب تھے اور قصیدہ پیش کرنے کی سعادت سے متفخر ہو رہے تھے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خوش ہو کر اپنا دستِ مبارک امام بوصیریؒ کے جسمِ مفلوج پر پھیرا اور ساتھ ہی ایک چادر بھی عطا فرمائی۔ جب امام بوصیریؒ کی آنکھ کھُلی تو واقعی اُنھیں مرض فالج سے نجات مل چکی تھی اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عطا کردہ یمنی چادر امام بوصیریؒ کے جسم صحت یاب پر تھی۔ اس چادر کی نسبت سے اس قصیدہ کو "قصیدہ بردہ" کہتے ہیں۔ بھائی صاحب بھی اس خیال سے "قصیدہ بردہ" پڑھتے اور اکثر پڑھتے پڑھتے سینے پر رکھ کر سو جاتے۔ چنانچہ بھائی صاحب پر دو مرتبہ فالج کا حملہ ہُوا مگر دونوں دفعہ اللہ کے فضل و کرم اور نبی پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کی برکت سے صحت یاب ہو گئے۔

بھائی صاحب ایک سچّے عاشقِ رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم تھے۔ عشقِ نبویؐ ان کے رگ و پے میں سمایا ہُوا تھا اور اسی سے اُن کے رشحاتِ قلم میں اثر تھا۔

عشقِ رسولؐ کی شمع زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے دل میں فروزاں رہی۔ لکھتے ہوئے اگر کسی ایسے فقرہ کی اصلاح مقصود ہوتی جس میں اسم محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر ہوتا تو اسے کبھی نہ کاٹتے بلکہ اس کے گرد ایک دائرہ لگا دیتے اور اس کے بجائے اصلاح شدہ فقرہ حاشیہ میں لکھ دیتے۔

جن دنوں بیمار تھے بھائی صاحب کو سعودی عرب میں منعقد ہونے والی کسی کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کے لیے دعوت موصول ہوئی۔ دل میں بڑی حسرت تھی کہ دیارِ حبیبؐ کی زیارت کو جائیں اور یہ موقعہ بھی بہت اچھا تھا مگر بیماری کی وجہ سے سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ آخر مقالہ بعنوان "اسلام کا نظریۂ تاریخ" لکھ کر بھیج دیا اور خود نہ جا سکے۔ اس محرومی کا اکثر ذکر کرتے اور فرماتے کاش میں اس قابل ہوتا کہ خود جاتا اور روضۂ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دیدار کرتا۔ قبل ازیں اس قسم کے کئی دعوت نامے بھائی صاحب کو امریکہ اور برطانیہ سے بھی مل چکے تھے مگر بھائی صاحب نے دیارِ فرنگ میں جانے کی کبھی خواہش نہ کی۔

بھائی صاحب نے اپنے پیچھے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا مگر دوست احباب کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے ہیں جن میں سے ہر ایک اُن کو "اپنا" تصور کرتا ہے اور اس کی بڑی وجہ ان کا ہر ایک سے حسن سلوک تھا۔ اسی طرح خاندان کا ہر فرد بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بھائی صاحب سب سے زیادہ اسی کے قریب تھے۔ راقم الحروف کا بھی یہی حال ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کی متاعِ عزیز چھن گئی ہے اور وہ بیک وقت باپ کی شفقت، بڑے بھائی کے پیار اور اپنے ہمدرد کی ہمدردیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے، علاوہ ازیں وہ اپنے پیچھے کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں جو کہ ان کی جدائی میں نوحہ خواں ہے۔

برادر ذی وقار ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انھیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا موصوف کی شخصیت ایک خاص

سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ یہ سانچہ بظاہر تو موت کے ہاتھوں اب ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن ان کی صفات، کردار و عمل کی خوبیاں اور رشحاتِ قلم ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے ؎

سینہ میں جس کے تھا دلِ بیدار چل بسا
چہرہ تھا جس کا مطلعِ انوار چل بسا
جس کا وجود علم و عمل کی مثال تھا
وہ اہلِ علم و صاحبِ کردار چل بسا
رہتا تھا بے نیاز جو نام و نمود سے
جو شخص تھا خلوص کا معیار چل بسا

(محمد اقبال صدیقی)

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم

پنجاب پبلک لائبریری کے مُلازمین کی نظر میں

لوگ جو اپنے علاوہ سب کے لیے جیتے، اور ہر کام سے پہلے رضائے خداوندی پر نظر رکھتے ہیں، پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم انہی میں سے ایک تھے۔ ہزاروں دلوں میں وہ آج بھی موجود، آج بھی زندہ ہیں۔ جن لوگوں میں مرحوم نے بیٹھ کر بیس سال کام کیا ان میں سے چند ایک کے تاثرات کچھ اس طرح ہیں:

محمد صدیق پچیس سال سے پنجاب پبلک لائبریری میں بحیثیت اٹنڈنٹ کام کر رہا ہے صدیق کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی ملازمت کے ان پچیس سالوں میں چوبیس سال لائبریری کے شعبہ انگریزی میں گزارے ہیں جبکہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی پچیس سال سے یہاں آرہے تھے وہ شعبہ انگریزی ہی میں بیٹھتے تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ حدیث، قرآن اور فقہ کی کتابیں پڑھتے دیکھا، چونکہ وہ یہاں بیٹھ کر اسی قسم کا تخلیقی کام کرتے تھے۔

وہ صبح سات آٹھ بجے کے قریب یہاں پہنچ جاتے تھے۔ بارش ہو یا آندھی یہ ان کا روز مرّہ کا معمول تھا۔ سٹاف تو چھٹی کر لیتا مگر جب سے وہ آنے لگے تو بہت کم ناغہ کیا کرتے۔

وہ جس دن یہاں نہ آتے ہم سمجھ لیتے کہ آج انھیں بہت ضروری کام پڑ گیا ہو گا۔

میرے ساتھ ان کے بہت اچھے تعلقات تھے اور مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ہر ضرورتمند کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیتے ہیں۔ لہذا میں نے جب بھی ان سے کسی ضرورت مند کا ذکر کیا انھوں نے مجھے اس کی مدد کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ دیا۔

محمد صدیق نے بتایا کہ لائبریری کے تمام اٹینڈنٹس کو باقاعدگی سے عیدی دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اگر انھیں کسی بچے کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ غریب ہے یا مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تو وہ اس کی ذمہ داری اٹھاتے اور اس سے کہتے کہ تم تعلیم جاری رکھو میں تمھاری فیس ادا کروں گا اور تمھیں کتابیں خرید کر دوں گا۔

ایک نہیں میں ایسے سینکڑوں لوگوں کو جانتا ہوں جنھیں وہ کئی کئی سال تک مالی امداد دیتے رہے لیکن کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ لائبریری میں اگر کوئی فقیر یا حاجت مند آجاتا تو ہم اسے صدیقی صاحب کے پاس بھیج دیتے وہ کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے۔

لائبریری کے ایک اور ملازم غلام نبی نے بتایا:

”وہ ہم سب کے لیے باپ کی طرح تھے۔ بڑے شفیق تھے۔ صدیقی صاحب نے گزشتہ بیس سال کا بیشتر وقت لائبریری میں گزارا اور تحقیقی کام میں مصروف رہے اس لیے لائبریری میں ایک شعبہ ان کے نام سے ہونا چاہیے جہاں لوگ بیٹھ کر ان کی طرح تحقیق کر سکیں۔“

شیخ ضیاء الحق پنجاب پبلک لائبریری کے لائبریرین ہیں اور ۱۹۶۶ء سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ صدیقی صاحب میرے یہاں آنے سے پہلے بھی لائبریری کے مستقل ریڈر تھے۔ وہ بہت مخلص تھے اور ہر ملنے والے کے لیے محبت اور رواداری کے جذبات رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان سے ملنے آتا تو وہ جتنی دیر ان کے پاس بیٹھا رہتا اس سے مصروفِ گفتگو رہتے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ اس وقت تک قرآن پاک کے تقریباً ۱۳ پاروں کا انگریزی ترجمہ کر چکے تھے جن میں سے آٹھ کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جبکہ عربی سے انگریزی میں بھی متعدد کتابوں کا ترجمہ کر چکے تھے۔ خود ایم اے اکنامکس تھے لیکن ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔

صدیقی صاحب میرے بہترین دوست تھے مجھے معلوم ہے وہ غریبوں اور بیواؤں کی امداد

کرتے تھے۔ ابھی ان کی وفات کے ایک روز بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ صدیقی صاحب سے تیس روپے ماہانہ لے کر جاتا تھا اور مکان کا کرایہ ادا کیا کرتا تھا۔

صدّیقی صاحب کی دیانت داری کا اندازہ آپ اس بات سے لگایئے کہ انھیں ترجمان القرآن کی طرف سے جو سیاہی لکھنے کے لیے ملتی تھی اس سے کوئی اور چیز نہیں لکھتے تھے۔ بڑے بڑے گورنمنٹ آفیسرز ان سے صلاح مشورے کے لیے آتے تھے۔ ادبی معاملات میں بھی بہت سے لوگ ان سے مشورہ لینے آتے تھے۔

عبدالحمید صدّیقی صاحب شرافت کا مجسّمہ تھے۔ میں یہ کہوں گا کہ ان جیسے چند ہی لوگ ہمارے ملک میں ہوں گے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، ان بارہ سال کے دوران میں نے انھیں کبھی غصّے کی حالت میں نہیں دیکھا۔

محمّد حنیف شاہد نے جو لائبریری کی اورینٹل سکیشن کے انچارج ہیں اور پچھلے دس برس سے پنجاب پبلک لائبریری سے منسلک ہیں، بتایا کہ جب میں لائبریری کا ملازم نہیں تھا تب بھی میں انھیں لائبریری میں دیکھا کرتا تھا۔ میری ان سے تقریباً پندرہ سال پہلے شناسائی ہوئی۔ یہ ان کا روزمرّہ کا معمول تھا کہ وہ صبح ساڑھے سات بجے گوجرانوالہ سے پہنچ جاتے اور چار ساڑھے چار بجے واپس چلے جاتے۔ یہ ان کے علم و ادب سے لگاؤ کا ایک زندہ جاوید ثبوت ہے۔ وہ کہا کرتے تھے "میں صبح تین بجے اُٹھتا ہوں نمازِ فجر ریلوے سٹیشن پر ہی پڑھتا ہوں اتنے میں گاڑی کا وقت ہو جاتا ہے اور میں نماز سے فارغ ہو کر ٹرین میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

محمّد حنیف شاہد نے بتایا "صدّیقی صاحب کے پاس لوگوں کا میلہ سا لگا رہتا۔ عام طور پر ضرورت مند لوگ ہی ان کے پاس آیا کرتے، ان میں مالی امداد والے بھی ہوتے اور قلمی امداد کے طالب بھی، طلبہ داخلوں کے چکّر میں آتے یا پھر فیس لینے آتے۔

غرض کہ ان کے پاس ہر طبقۂ فکر کا آدمی آتا۔ وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ اور میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں جو ان سے مایوس ہو کر گیا ہو۔

لائبریری میں اگر اچانک کسی کو کچھ پیسوں کی ضرورت ہوتی تو وہ بلا جھجک عبدالحمید صدیقی صاحب کے پاس چلا جاتا اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہماری لائبریری کے ایک چھوٹے سٹاف ممبر سے لے کر لائبریرین تک تقریباً تمام لوگوں نے ایسے موقعوں پر صدیقی صاحب سے امداد حاصل کی ہے۔

صدّیقی صاحب ہونہار لوگوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے اور ایسے لوگوں کو متعارف کرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔

مَیں آپ کو اپنی ہی مثال دُوں، جب میری دو تین کتابیں شائع ہوئیں تو میں نے ان سے تبصرے کے لیے کہا اور انھوں نے کمال شفقت سے تبصرے لکھے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ نئے لوگوں کو متعارف کرانے کی کس حد تک کوشش کرتے تھے۔

عبدالحمید صدّیقی صاحب اخلاقی طور پر بہت بلند کردار کے مالک تھے چھوٹوں بڑوں سب سے اخلاق اور عجز و انکساری سے پیش آتے۔

صدّیقی صاحب اگرچہ لائبریری کے مُلازم نہ تھے اس کے باوجود تمام لوگ انھیں اپنا "کولیگ" سمجھتے تھے اور ان کا برتاؤ بھی ہمارے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا۔ اگر ہم ان کے کھانے پینے کے وقت وہاں پہنچ جاتے تو وہ ہمیں ساتھ بٹھاتے، کھانا کھلاتے اور چائے پلاتے۔ اس معاملہ میں وہ کسی سے امتیازی سلوک نہیں برتتے تھے۔

وہ ایک اچھے مشیر تھے، لائبریری کے کسی ملازم کو کوئی تکلیف ہوتی جھٹ ان کے پاس پہنچ جاتا، وہ مخلصانہ مشورہ بھی دیتے اور اگر کوئی کام خود کر سکتے تو کر دیا کرتے تھے۔

اگر کسی کے متعلق انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ اسے پڑھنے کا شوق ہے لیکن کسی وجہ سے وہ اپنا یہ شوق پورا نہیں کر سکتا تو ایسے شخص کو اپنی ذاتی کتابیں تحفے میں دے دیا کرتے تھے۔ ترجمان القرآن جب بھی شائع ہوتا لائبریری میں چار پانچ آدمیوں کو جن کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ واقعتاً کچھ پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں اس کی کاپی بڑے اہتمام سے دیا کرتے تھے اور دیتے وقت زور اس بات پر دیتے تھے کہ ایڈیٹوریل پڑھو اور مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی اور میں نے لکھنے میں کس حد تک انصاف کیا ہے۔

عبدالحمید صاحب اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باوجود گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس کے متعلق وہ خود کہا کرتے تھے: "میں درویش ہوں مجھے خود ستائی پسند نہیں۔"

(خوشنود علی خاں)

تاثرات

۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء کی صبح پروفیسر عبدالحمید صدیقی کی اچانک رحلت سے جہاں اعزہ و اقارب کو انتہائی صدمہ ہوا وہاں ملک کے طول و عرض میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ پوری ملتِ اسلامیہ اور دنیائے علم و ادب نے اس عظیم نقصان کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ہر مکتبِ فکر کے اہلِ علم و اہلِ قلم حضرات نے اُن کی علمی و دینی خدمات کی بنا پر انھیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ ممتاز راہنماؤں اور سیاسی و سماجی حلقوں نے اس ممتاز عالمِ دین اور دانشور کی وفات کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے ان کی کاوشوں اور جدوجہد پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اخبارات نے اداریے لکھے، رسائل میں مضامین چھپے اور لاتعداد تعزیتی پیغامات وصول ہوئے۔ اگرچہ اس کتاب میں ان تمام تاثرات اور مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں تاہم ہم نے ایسی بیشتر تحریروں میں سے اقتباسات لے کر اُن کو زیرِ نظر مضمون میں یکجا کر دیا ہے۔

درویش خدامست

. . . پروفیسر عبدالحمید صدیقی انتقال کر گئے۔ یہ مختصر سی خبر کیسی رُوح فرسا ہے۔ سردی کی خوفناک لہر کی طرح احساس کی گہرائی میں اُتر جانے والی، سوچ کے ہر زاویے کو درہم برہم کر دینے والی، فکر و نظر کو کجلا دینے والی اور ایسی ذہنی کیفیت

سے دوچار کردینے والی کہ جب واضح اشارے بھی بے مفہوم اور بے معنی دکھائی دیتے ہیں۔ سچ ہے کہ آج عبدالحمید صدیقی ہی ہم سے جدا نہیں ہوئے "اشارات" سے ابلاغ جدا ہو گیا۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے جامعہ پنجاب سے معاشیات میں ایم۔اے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا تھا اور اپنے دورِ شباب ہی میں تقسیمِ ہند سے قبل جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ پیشے کے طور پر انھوں نے اپنے لیے تدریس کا میدان چنا۔ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں معاشیات کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ معارفِ اسلامیہ کراچی کے باقاعدہ ریسرچ اسکالر تھے۔ ۱۹۵۲ء میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے انھیں اپنے ممتاز و مؤقر ماہنامے ترجمان القرآن کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ جب سے وہ مسلسل ترجمان میں "اشارات" کے عنوان سے بصیرت افروز اور پُرمغز اداریہ لکھتے چلے آرہے تھے۔ اس اثنا میں انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی جاری رکھیں۔ ایّوب خاں کے دَور میں جماعتِ اسلامی کا رکن ہونے کے "جرم" میں انھیں پیشۂ تدریس کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا گیا۔

وہ ایک فاضل اور مہربان استاد ہی نہیں بلند پایہ صحافی، عالم اور مصنّف و مترجم بھی تھے۔ انھوں نے سیرت، تاریخ اسلام، تعلیمات اور مغربی تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر وقیع تصنیفات کا گراں قدر علمی ترکہ چھوڑا ہے۔ وہ بیک وقت انگریزی و اردو کے بلند پایہ انشا پرداز و نثّار تھے۔ انھوں نے ریاض الصالحین، مشکوٰۃ اور مسلم شریف کے ترجمے انگریزی میں کیے اور بعض اہم علمی مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی ایک شاندار علمی خدمت یہ بھی تھی کہ انھوں نے انگریزی زبان میں قرآن مجید کے پندرہ پاروں کی تفسیر لکھی۔ افسوس زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس معرکۃ الآرا کام کو انجام تک نہ پہنچا سکے۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی ایسے شخص تھے جن کی زندگی میں ان کے جاننے والوں کو کمزوریاں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ البتہ ان کا ظرفِ شخصیت خوبیوں سے بھرا پڑا نظر آتا تھا وہ حقیقتاً درویش خدامست تھے۔ ان کی زندگی سادگی، استغناء اور پابندیٔ حدود کا بہترین نمونہ تھی۔ خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔

(اداریہ روزنامہ جسارت، ۱۹/ اپریل ۱۹۷۸ء)

علم و دانش کا مہرِ تاباں

.... مرحوم علم و دانش کے مہرِ تاباں اور سیرت و کردار کے روشن مینار تھے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیت، پیہم ریاضت اور اسلام کے ساتھ سچی رفاقت کے سبب پورے ملک پر چھا گئے۔ ایک سچے محقق اور صاحبِ قلم کی طرح وہ نام و نمود سے بالاتر رہے اور تخلیقی صلاحیتیں خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ اُن کا اندازِ تحریر بڑا وقیع اور مُدلّل تھا اور مسائل کا تجزیہ نہایت گہرائی سے کرتے تھے۔ انھوں نے ہر عہدِ آمریّت میں ماہنامہ ترجمان القرآن کے معرکۃ الآرا اداریے لکھے اور قوم کے شعور کو زندہ رکھا۔ اُن کی وفات سے پاکستان کو عظیم نقصان پہنچا ہے۔

(ہفت روزہ زندگی، اپریل ۱۹۷۸ء)

فاضل شخصیّت

.... مرحوم ایک فاضل شخصیت تھے، مشفق اور محنتی استاد، درویش صفت، الّلسان، وسیع المطالعہ، اہلِ علم سے گہرا تعلق و رابطہ رکھتے تھے۔ طبیعت کے مرنجان مرنج اور بہت متواضع تھے۔

(ہفت روزہ الاعتصام، اپریل ۱۹۷۸ء)

قومی المیہ

. . . . ایسے وقت میں جبکہ ملک کو ان جیسے قابل اور اہلِ دانش مفکر افراد کی سخت ضرورت تھی ان کی رحلت ایک قومی المیہ ہے جو ناقابلِ تلافی ہے۔

(جناب مولانا گلزار احمد مظاہری، سیکرٹری جنرل جمعیّت اتحاد العلمأ پاکستان، روزنامہ جسارت، ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

عظیم علمی شخصیّت

. . . . . پروفیسر عبد الحمید صدیقی کی وفات سے نہ صرف تحریکِ اسلامی ایک علمی اور محنتی شخصیّت سے محروم ہوئی بلکہ آج ہمارا ملک بھی ایک عظیم علمی شخصیّت سے محروم ہو گیا ہے۔ مرحوم جیسی علمی شخصیّتیں اب ہمارے اندر کم ہی پیدا ہوں گی۔ مرحوم نے اپنی زندگی کو اللہ کے دین اور ملک کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور اپنی تصانیف و تالیف کے ذریعے غیر اسلامی نظریات کو دلائل کے ساتھ رَدّ کیا اور دنیا کو اسلام کی طرف مائل کیا۔

(جناب مولانا محمد چراغ صاحب، شیخ الجامعہ عربیہ گوجرانوالہ، روزنامہ جسارت ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء)

گراں قدر خدمات

. . . . پروفیسر عبد الحمید صدیقی نے اسلامی نصب العین کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مرحوم اپنی ساری زندگی کے دوران مسلم نوجوانوں کے ذہن میں اسلام کی بالادستی مستحکم بنانے کے لیے اَنتھک جدّوجہد کرتے رہے۔

(جناب عبد الغفور بھٹی مشیر برائے زراعت حکومت پنجاب روزنامہ جسارت ۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء)

ناقابلِ فراموش خدمات

.... پروفیسر عبدالحمید صدّیقی کی اچانک وفات کی اطّلاع پاکر مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ ایک عظیم اسلامی ادیب تھے اور انھوں نے انتہائی مہارت سے قرآن مجید اور احادیث کا ترجمہ کیا تھا۔ پروفیسر عبدالحمید صدّیقی مرحوم کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

(جناب شیخ حسن بن عبداللہ الشیخ، وزیر تعلیم سعودی عرب
روزنامہ جسارت، ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء)

عظیم مُفکّر

.... پروفیسر عبدالحمید صدّیقی ایک عظیم مفکّر اور قرآن مجید کے مترجم تھے۔ انھوں نے اپنی علمی اور قلمی کاوشوں کے ذریعہ اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

(ڈاکٹر احمد تتنجی، اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل عالمی تنظیم
نوجوانانِ اسلام، روزنامہ جسارت، ۲۵ اپریل ۱۹۷۸ء)

قیمتی سرمایہ

.... مرحوم کی دینی خدمات مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کی وفات سے تحریکِ اسلامی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور ملک ایک ممتاز عالمِ دین، صحافی اور استاد سے محروم ہو گیا ہے۔

(مولانا سلامت اللہ صاحب،
امیر جماعتِ اسلامی پشاور)

قومی مفاد

. . . . مرحوم نے اپنی زندگی قوم کے لیے وقف کر دی تھی۔ مرحوم ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔

(جناب علّامہ عنایت اللہ صاحب، امیر جماعت اسلامی، گجرات)

عالمِ باعمل

. . . . مرحوم ایک عالم باعمل اور درویش خدامست تھے جو پوری زندگی اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف رہے اور اپنی بیش بہا عالمانہ تصنیفات اور اپنے گراں قدر مضامین کی وجہ سے اسلامی دانش وروں میں بہت اُونچا مقام رکھتے تھے۔

(جناب کرم الٰہی صاحب، امیر جماعت اسلامی ضلع جہلم)

رُوحانی تعلّق

. . . . اُن کے بلند پایہ اشارات کی بدولت ہمارا اُن سے رُوحانی تعلق قائم ہوگیا تھا۔ ہم ان کی خدمات کو تاحیات فراموش نہیں کر سکتے۔

(جناب مولانا بدرالدین صاحب، ضلع چترال)

اولوالعزم صاحبِ قلم

. . . . پروفیسر عبدالحمید صدّیقی کی اچانک وفات ایک ایسا عظیم حادثہ ہے جس سے تحریکِ اسلامی اپنے ایک اولوالعزم صاحبِ قلم سے محروم ہوگئی ہے۔ عظیم صحیفے ترجمان القرآن کے "اشارات" سے قوم میں متعارف ہونے والا یہ اَن تھک، جری اور بیباک

نقاد، افسوس کہ ہم سے ایسے وقت میں رخصت ہوگیا جب اس کی ضرورت ہمیں ہر زمانہ سے زیادہ تھی۔ مرحوم و مغفور کے علمی کام جو انھوں نے متعدد زبانوں میں اور اُن کے تراجم کے ذریعے سرانجام دیے رہتی دُنیا تک ہمارے لیے مشعلِ راہ رہیں گے۔

(ڈاکٹر محمد احمد صاحب واسطی
ناظمِ نشر و اشاعت جماعت اسلامی کراچی)

بڑا کارنامہ

.... جناب عبدالحمید صدّیقی نے اسلامی تعلیمات خصوصاً قرآن پاک کی تشریح و تفسیر کے سلسلہ میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ موصوف نے قرآنِ پاک اور احادیثِ نبوی کا انگریزی میں ترجمہ کر کے بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

(جناب راز کاشمیری، سیکرٹری جنرل بزمِ تخلیقِ ادب گوجرانوالہ
روزنامہ مشرق، ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

دُنیائے علم و ادب کا المیہ

.... پروفیسر عبدالحمید صدّیقی کا انتقال دُنیائے علم و ادب کا المیہ ہے۔ مرحوم ایک جیّد عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ کم گو اور انتہائی منکسر المزاج شخصیّت تھے۔ تاریخِ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی کمی عرصہ دراز تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

(جناب قاضی اکرام بشیر صاحب، سیکرٹری مجلس نو،
روزنامہ نوائے وقت، ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

اسلاف کی یادگار

.... پروفیسر عبدالحمید صدیقی اسلاف کی یادگار تھے۔ وہ منکسر المزاج، خوش خُلق اور نہایت شریف النسان تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو لوٹانے میں صرف کی اور لادینی نظام اور اسلام دشمن طاقتوں کے خاتمہ کے لیے نئی نسل کو اسلامی لٹریچر کے بے پناہ ہتھیار مہیا کیے ہیں۔

(جناب عزیز انصاری صاحب، مسلم لیگی راہنما، روزنامہ مشرق، ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

فخرِ قوم

.... مرحوم ان شخصیات میں سے ایک تھے جن پر قوم فخر کرسکتی ہے۔

(جناب ارشد میر ایڈووکیٹ گوجرانوالہ، روزنامہ مشرق، ۱۲ اپریل ۱۹۷۸ء)

قابلِ رشک زندگی

.... ان کی خدمات جو دینِ حق کی سربلندی کے لیے ہیں وہ قابلِ تعریف اور ان کی کامیاب و کامران زندگی قابلِ رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے اور ہم سب کو مرحوم کی طرح دینِ حق اور تحریکِ اسلامی کا بے باک سپاہی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

(جناب الحاج سردار بہادر خان ایڈووکیٹ، ایبٹ آباد، ہفت روزہ الاعتصام، اپریل ۱۹۷۸ء)

گلِ سرسبد

.... حمید الانسانیت کا ایک گلِ سرسبد تھا جس کی خوشبو سے پورے صحنِ چمن میں مہک تھی۔ وہ صرف احباب کا ہی بہی خواہ و غم خوار نہ تھا بلکہ ضعیف ماں، ذہین بھائیوں، غمخوار بیوی اور نوجوان بچیوں کی آرزوؤں کا بھی ایک بیش قیمت خزانہ تھا جس کے لٹ جانے پر آج وہ بے حال ہیں۔ انھوں نے گلشنِ اسلام کی آبیاری اپنے خون سے کی اور اس میں ساری جسمانی اور دماغی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ان کی ایک ہی آرزو تھی کہ یہ سرزمینِ پاک جو اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے پھر سے گہوارہ اسلام بن جائے۔ ان کے روز و شب صرف اس لیے وقف تھے کہ انسانیت اپنے اصل مقام سے آگاہ ہو جائے۔ آہ! آج جب کہ ان کی شدید ضرورت ہے اور ان جیسے لوگ خال خال ملتے ہیں، یہ خلا کیسے پُر ہوگا۔ کون ہے جو ان کے علم و فضل اور خلوص کی دولت سے مالا مال ہوتے ہوئے ساری صلاحیتیں شب و روز اس دورِ پُرفتن میں اسلام کے لیے وقف کر دے۔

(جناب نسیم سوہدروی (علیگ) کے مضمون مطبوعہ
ہفت روزہ الاعتصام جون ۱۹۷۶ء سے ایک اقتباس)

دل کے غنی

.... صدیقی صاحب نہایت غریب پرور انسان تھے۔ لائبریری میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے فیض یاب نہ ہوا ہو۔ وہ بڑے سخی اور دل کے غنی انسان تھے۔ لائبریری میں جب بھی کوئی حاجت مند آتا تو معمول کے مطابق اُسے صدیقی صاحب کے پاس بھیج دیا جاتا۔ وہ حتی المقدور امداد فرماتے۔ میں نے آج تک کسی کو اُن کے

ہاں سے خالی ہاتھ جاتے نہیں دیکھا۔

(جناب محمد حنیف صاحب شاہد، ڈپٹی لائبریرین، پنجاب پبلک لائبریری
لاہور کے مضمون مطبوعہ ہفت روزہ چٹان مئی ۸۰ء سے ایک اقتباس)

تحریکِ اسلامی کا صُوفی

.... پروفیسر عبدالحمید صدّیقی مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان ایسا مخلص انسان بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ ساری زندگی نہایت خاموشی سے درویشانہ انداز میں گزار دی۔ عزیزوں ہی کے ساتھ نہیں غیروں سے بھی محبّت سے پیش آتے تھے۔ میں ان کو تحریکِ اسلامی کا صُوفی کہنا چاہتا ہوں۔

(جناب صدیق احمد صاحب صدیقی کے مضمون مطبوعہ
ہفت روزہ زندگی، اگست ۸۰ء سے ایک اقتباس)

پیکرِ انسانیت

.... مرحوم کی دینی، علمی اور ادبی خدمات کا ایک زمانہ مُعترف ہے، وہ نہایت خلیق، وضعدار اور مجسم پیکرِ انسانیت تھے۔ وہ علم کا ایک ایسا سرچشمہ تھے جن سے ایک عالم سیراب ہوُا۔

(قرار دادِ تعزیت گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ)

نامور اسکالر

.... نامور ادیب، دانشور اور ماہنامہ ترجمان القرآن کے مدیر کی موت سے عالمِ اسلام ایک نامور اسکالر سے محروم ہو گیا ہے۔

(قرار دادِ تعزیت، بار ایسوسی ایشن، مری)

زندۂ جاوید

.... مرحوم نے تحریکِ اسلامی کی جو خدمات انجام دی ہیں اور تصانیف تحریر فرمائی ہیں، وہ ان کو تاقیامت زندۂ جاوید رکھیں گی۔ خُدا ہم کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (جناب شاہ محمد صاحب آزاد، نواب شاہ)

عظیم فلاسفر

.... عبدالحمید صدّیقی کی وفات سے پاکستان ایک بہت بڑے اسکالر اور فلاسفر سے محروم ہو گیا ہے۔ ان کی کمی عرصہ دراز تک محسوس کی جاتی رہے گی۔ ان کے "اشارات" اسلام کا عظیم سرمایہ ہیں، خدا اُن کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لے۔

(جناب حافظ نعمان احمد صاحب انصاری، فیصل آباد)

علم و ادب کی دُنیا میں خلا

.... پروفیسر عبدالحمید صدّیقی کی وفات سے علم و ادب کی دُنیا میں جو خلا پیدا ہُوا ہے وہ بڑی مشکل سے پُر ہو گا۔ (جناب چودھری عبدالغفور، میاں چنوں)

عظیم نقصان

.... ان کی وفات تحریکِ اسلامی کا عظیم نقصان ہے۔ مرحوم تحریکِ اسلامی کے بے لوث اور مخلص کارکن اور راہنما تھے۔ ان کے خلوص، نیک نیتی اور دینی خدمات

کے سب معترف ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی نیکیاں قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (جناب محمد عمر صاحب قریشی، حیدر آباد)

(محمد اقبال صدیقی)

اشاراتِ صدّیقی

کے سب محترم حضرات ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی نیکیاں قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (جناب محمد عمر صاحب قریشی، حیدرآباد)

(محمد اقبال صدیقی)





پنجاب پبلک لائبریری کا وہ گوشہ جسے یہ شرف حاصل ہے کہ وہاں مرحوم
بیٹھ کر ربع صدی تک تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم اپنی تحریروں کے آئینہ میں

۱۸ راپریل ۱۹۷۸ء کو صبح صادق ہونے سے پہلے دنیائے اسلام اپنے جس بطلِ جلیل سے محروم ہوئی اس کی زندگی ملک و ملّت کی ایک بیش قیمت متاع تھی۔ اس متاع کے چھن جانے پر ساری ملّتِ اسلامیہ نے اظہارِ تأسف کیا۔ ہر مکتبِ فکر کے لوگوں نے مرحوم کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ بلاشبہ ان کی وفات سے دینی اور علمی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی اِلّا یہ کہ خدائے ذوالجلال اس کمی کو اپنے فضل و کرم سے پورا کر دے۔

مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے ایسے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ محمودہ سے نوازا تھا جس کے باعث وہ نہ صرف جماعتِ اسلامی میں بلکہ جماعت سے باہر کے حلقوں میں بھی بے حد مقبول تھے۔ جو شخص بھی ان سے متعارف ہوا وہ ان کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جو فرد بھی جتنا ان کے قریب آیا وہ، اسی قدر ان کا گرویدہ ہو گیا۔ مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ سچی وابستگی اور اس کی سربلندی کے لیے گہری لگن عطا کی تھی۔ وہ عین عالم شباب میں تحریکِ اسلامی سے وابستہ ہوئے اور اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک اسلام کی خدمت کے لیے ہمہ تن مصروف رہے۔ اس مقدّس فریضہ کی انجام دہی میں انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ انھوں نے دل و دماغ کی ساری صلاحیتیں بلکہ جسم و جان کی ساری قوتیں پوری یکسوئی، اخلاص اور تدبّر کے ساتھ راہِ خدا میں صرف کیں اور اس معاملے میں

کوئی ڈر یا خوف، کوئی دنیوی لالچ یا ترغیب و تحریص، کوئی مالی پریشانی یا گھریلو الجھن ان کی راہ میں حائل نہ ہوسکی۔ انھوں نے اپنے عمل و کردار سے ثابت کردیا کہ انسان اپنی حیاتِ مُستعار کا مالک نہیں بلکہ امین ہے اور اسے امین بن کر ہی اس کو اللہ کی راہ میں صرف کرنا چاہیے۔

مرحوم زندہ رہے تو ایک اعلیٰ وارفع نصب العین کے لیے اور دُنیا سے رخصت ہوئے تو جملہ اہلِ دنیا کے لیے بالعموم اور اہلِ اسلام کے لیے بالخصوص ورثہ بے بہا چھوڑ گئے ـــــ تسلیم و رضا کا ورثہ، عزم و وفا کا ورثہ، جرأت و استقلال کا ورثہ، الفت و محبتِ اسلام کا ورثہ، عمل و یقین کا ورثہ اور اپنی تحریروں اور تصانیف کا ایک ایسا گنجِ گراں مایہ جس سے رہتی دُنیا تک نسلِ انسانی استفادہ کرتی رہے گی۔

مرحوم نے اپنی علمی زندگی میں کم و بیش پچیس تیس کُتب لکھی ہیں جن میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ و تفسیر، صحیح مسلم اور مشکوٰۃ شریف کے انگریزی تراجم اور "سیرت النبیؐ" جیسے بلند پایہ علمی کارہائے نمایاں شامل ہیں۔ مرحوم اسلامی علوم کے علاوہ مغربی علوم میں بھی گہری دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سرمایہ کاری، اشتراکیت اور اسلام کے تقابلی مطالعہ پر بڑی مدلل کتب تحریر فرمائیں جن میں "انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام" اور "مغربی تہذیب کے سرچشمے" سرِفہرست ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخ، معاشیات اور فلسفہ پر بھی مرحوم کی کئی کُتب ہیں جن میں سے "اسلام کا فلسفہ تاریخ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب کا کویت سے عربی ترجمہ بھی "تعبیر التاریخ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ ان تخلیقی کاموں کے علاوہ مرحوم نے متعدد عربی اور انگریزی کتابوں کے تراجم کیے جو اپنی زبان، سلاست اور روانی کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ ماہنامہ ترجمان القرآن کے "اشارات" جو کسی زمانہ میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی خود تحریر فرمایا کرتے تھے اُس کی بھاری ذمہ داری بھی مرحوم کو سونپ

دی گئی جس کو انھوں نے رُبع صدی سے لے کر آخر دم تک بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ گزشتہ پچیس سالوں پر پھیلے ہوئے یہ اشارات جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے تھے بذاتِ خود مرحوم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہیں۔ مرحوم کے تحریر کردہ "اشارات" کو ماہنامہ ترجمان القرآن کے قارئین میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔

مرحوم بیک وقت انگریزی، اُردو اور عربی تینوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ نیز اسلام اور مغربی علوم پر اُن کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ ان خوبیوں نے ان کو ایک جامع کمالات شخصیت بنا دیا تھا۔ ان کی تحریروں کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اگر ایک طرف ان میں زبان کی چاشنی ہوتی ہے تو دوسری طرف نفسِ مضمون پُرمغز، ٹھوس دلائل اور حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر مرحوم کو ڈھنگ سے بات کہنے اور دلائل پیش کرنے کی ایسی خداداد صلاحیت اور قدرت حاصل تھی کہ جو بھی اُن کی تحریروں کو پڑھتا متاثر اور قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔

زیرِ نظر مضمون مختلف موضوعات پر مرحوم کی چیدہ چیدہ تحریروں سے لیے گئے اقتباسات پر مبنی ہے۔

وجود باری تعالیٰ پر ایمان

خدا کے وجود کا اعتراف فطرتِ انسانی کا ایک لازمی جزو ہے۔ جس طرح انسان اپنی ہستی کے ثبوت کے لیے کسی منطقی دلیل کا محتاج نہیں اسی طرح وجودِ خالق کا اعتقاد کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ نفس الامری حقیقت ہے جس کو انسان بلا ردّ و کدّ تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ گویا یہ تصوّر انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود و قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح ایمان باللہ سے

جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزین ہے، رُوگرداںی نہیں کی جاسکتی۔

مرحوم اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

..... کیا خدا ہے ؟ یقیناً ہے ! مجھے اس کے وجود کے بارے میں اتنا ہی محکم یقین ہے جتنا کہ اس کائنات کی دُوسری حقیقتوں کا ہے۔ میں جس قدر وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ہوں اور دُنیا میں موجود ہوں اس سے کہیں زیادہ وثوق کے ساتھ میں خدا کے وجود کا دعویٰ کرسکتا ہوں۔

ایمان باللہ ہی سے اس کائنات کے وجود کی صحیح تعبیر و توجیہ کی جاسکتی ہے۔ اس کے ذریعہ انسانی ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا ہے کہ انسان اپنی مستقل شخصیت رکھتا ہے اور محض مادہ اور قوت کا پیکر نہیں۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کے اندر اس احساس کی آبیاری کرتا ہے کہ نوعِ بشری کے سارے ارکان فطرت کے اعتبار سے برابر اور ایک دُوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں مربوط ہیں۔ پھر اُس بلند و بالا ذات پر ایمان ہی ہمیں اپنے حقوق سے آشنا اور اپنے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ ان حقوق اور فرائض کی تہ میں یہ بنیادی تصوّر کارفرما ہے کہ ہم ایک ذات کی نگاہ میں جس کی محبت پاک، اور جس کا انصاف بے لاگ ہے، سب یکساں اور برابر ہیں۔ اس نظریۂ حیات کو اپنانے سے ہمارے اندر اس بات کا شعور بیدار ہوتا ہے کہ ذلت و ناکامی یا فلاح و کامرانی کا واحد سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی مشیّت کے بغیر ایک پتّا بھی نہیں ہل سکتا، اس لیے قدرتی طور پر یہ عقیدہ انسان کو قوت و طاقت کے ایسے لازوال خزانے عطا کرتا ہے جن کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ یہ عقیدہ ہی وہ محکم اور ٹھوس بنیاد ہے جس پر مستقل اور پائیدار اقدار کا ایک وسیع اور عظیم الشان محل تعمیر ہوتا ہے کیونکہ ازل و ابد کا تصوّر اسی ذات سے وابستہ ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۶۰ء)

قرآن مجید اور نوعِ انسانی پر اس کے احسانات

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وہ الہامی کتاب ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پُوری انسانیت کے لیے نازل فرمائی گئی اور جس میں نوعِ بشری کی فلاح کے لیے بیان کردہ مختلف مضامین میں ایک پُرمعنی ربط پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید ایمان و اعتقاد، رُوحانیت، اخلاقیات، معاشریات، سیاسیات، معاشیات اور قانون جیسے نازک اور اہم مسائل کو نہایت جامع انداز میں اس قدر خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے کہ جس کی انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید کے نزول کے کئی ایک مقاصد ہیں جن کو مرحوم نے مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

... قرآن مجید نے خود اپنے اس دُنیا میں نزول کے متعدد مقاصد بیان کیے ہیں۔ مثلاً یہ صداقت اور حکمت سے لبریز ہے، اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت کا پُورا سامان موجود ہے۔ یہ رُشد و ہدایت کا سرچشمہ، خیر اور بھلائی کا مخزن اور شرافت اور نیکی کا مبدا و منبع ہے۔ اس کی تعلیمات ہر خطا سے پاک، ہر کجی سے عاری، ہر عیب سے مُنزّہ اور ہر سُقم سے مامون ہیں۔ اس کی تصریحات بڑی جامع اور حکیمانہ ہیں اور ہر قسم کی غلطی سے مُبرّا ہیں جو بندگانِ خدا اپنے آپ کو رُوحانی عوارض سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، یہ کتاب انھیں ان سے بچاتی ہے اور جو ان میں مُبتلا ہو کر صحت کے طالب ہوں، انھیں شفا بخشتی ہے۔ یہ ایک عدل کی ترازو ہے جس میں ہر انسان اپنے افکار و اعمال کو تول کر ان کی صحیح قدر و قیمت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس کے ذریعہ کھرے کو کھوٹے سے باآسانی الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نُور ہے جو انسان کے قلب و دماغ کو منوّر کرتا ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنے

آپ کو پہچانتا اور اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۷۸ء)

قرآن مجید کے انسانیت پر ان گنت عظیم احسانات گنواتے ہوئے مرحوم لکھتے ہیں :

... انسان پر کتابِ الٰہی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے انسان کو ہدایت اور اس کی فلاح و کامرانی کے لیے اُسے اپنے خالق اور مالک کا صحیح شعور اور احساس عطا کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں وہ جتنے غلط اور گمراہ کُن تصوّرات کا شکار ہو سکتا تھا، ان سب کے تباہ کُن نتائج سے بھی اسے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اس ضمن میں اس نے انسان کے قلب و دماغ پر سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کا نقش ثبت کیا ہے کہ قدرت کا یہ وسیع و عریض کارخانہ یُونہی محض بخت و اتفاق سے معرضِ وجود میں نہیں آ گیا بلکہ یہ ایک زبردست اور بے مثال مُدبّر کے حُسنِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ یہ مُدبّر یکتا و بے نیاز ہے اور اس نے کسی دُوسری ذات اور قوّت کو اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنی تدبیر میں شامل نہیں کیا۔ پھر قرآن مجید نے انسان کو اس حقیقت سے بھی آشنا کیا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان صرف یہی تعلق نہیں کہ خالق نے کائنات کو وجود بخشا بلکہ پیدائش کے بعد یہ قادرِ مطلق اپنی مخلوق کی باقاعدہ نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ اِس کائنات کے اندر جس کو جو کچھ مل رہا ہے اور جس طرح بھی اس کی پرورش ہو رہی ہے وہ سب براہِ راست اسی ربّ عظیم کی صفتِ ربُوبیت کی کرشمہ سازی ہے۔

یہ بے ہمتا ذات ہر جگہ موجود، سب کچھ جانتی اور دیکھتی ہے، ہر آواز کو سُنتی ہے، ہر ایک کے قریب اور ہر ایک کے ساتھ ہے۔ اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے۔ وہی ساری کائنات کا اصل بادشاہ اور حاکم ہے اور سب کچھ اسی کے دستِ تصرّف میں ہے۔ اس با اختیار اور لاشریک ہستی نے

جو اپنے بندوں پر انتہائی مہربان اور رحیم ہے، اُن کے افکار و اعمال اور اُن کے جذبات و احساسات کی صحیح تربیت کا بھی انتظام کیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اُس نے دُنیا کی ہر قوم میں وہ ہادی بھیجے جنھوں نے نہ صرف تعلیماتِ الٰہی سے انسانوں کو روشناس کیا بلکہ ان پر عمل پیرا ہو کر تعلیماتِ ربّانی کے عملی مضمرات بھی ان پر واضح کر دیے —— یہ مختصر الفاظ میں قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

.... دُنیا کی کسی مذہبی کتاب نے توحید کا اتنا واضح اور جامع تصوّر نہیں دیا جتنا کہ قرآن مجید نے دیا ہے۔ دُوسرے مذاہب میں جو اب ہمارے درمیان موجود ہیں، ان میں اوّل تو توحید کے نقوش ہی واضح نہیں ملتے اور اگر کہیں ان کا پتہ چلتا بھی ہے تو صرف اسی قدر کہ بس ایک خالق کو مان لیا جائے۔ —— اسلام نے اس سلسلے میں انسان کو بتایا ہے کہ اس کو ایک ماننے کا مطلب یہ نہیں کہ بس اُس کے ساتھ کسی دُوسرے کو ساجھی نہ بنایا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ جس طرح اپنی ذات، صفات اور تدبیر میں یکتا ہے بالکل اسی طرح اس نے زندگی گزارنے کے جو ضابطے دیے ہیں اس میں بھی کوئی اس کے مدّمقابل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے پہلی بار انسان کو اس حقیقت سے آشنا کیا ہے کہ جب خلق اُس کی ہے تو امر بھی اسی کا ہونا چاہیے۔

.... قرآن مجید نے انسانی فکر و نگاہ میں دُوسرا بڑا انقلاب یہ پیدا کیا ہے کہ بنی نوع انسان کے درمیان شریف اور کمین کی تفریق مٹا کر عزّت اور ذلّت کی بنیاد حسب و نسب اور رنگ و نسل کے بجائے ایمان اور اخلاق کو قرار دیا ہے۔ وحدتِ نوعِ انسانی، اسلام میں ایک نظریہ نہیں بلکہ مؤکّد حقیقت ہے۔ اس نے اُن تمام جاہلی نظریات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو انسانوں کی مختلف نسلوں کو مختلف مورثوں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ پھر اس نے مختلف قبائل، خاندانوں اور نسلوں کے بارے میں یہ بات بتا کر کہ ان کا

مقصد باہمی تعارف کے علاوہ اور کچھ نہیں، جدید و قدیم جاہلانہ قوم پرستی اور نسل پرستی کا قلع قمع کیا ہے اور انسان کے دل و دماغ میں اس بات کو راسخ کیا ہے کہ اللہ کے ہاں شرف و قبولیت کا تمام تر دار و مدار صرف نیکی پر ہے۔ یہ نسلی، قومی اور آبائی غرور سب باطل اوہام ہیں جن میں مُبتلا ہو کر انسان نے انسانیت کی فطری وحدت کو پارا پارا کیا ہے۔

.... قرآن مجید کے عظیم احسانات میں عورتوں کو بھی خاصا حصّہ ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو طبقہ جتنا مظلوم تھا باری تعالیٰ نے اتنا ہی اسے مظلومیت سے نجات دلانے کا التزام فرمایا ہے۔ خدا کی اس آخری کتاب کے نزول سے پیشتر عورت کی حیثیت محض کھلونے یا سامانِ عیش سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ بے جان اشیاء کی طرح ایک مرد سے دوسرے مرد کی تحویل میں چلی جاتی اور کسی فرد کے انتقال کے بعد اس کے وارث کے پاس دوسرے اثاثے کی طرح منتقل ہو جاتی۔ اس کے متعلق لوگوں کے اندر یہ بات مشہور تھی کہ اس کا خمیر گناہ سے اٹھایا گیا ہے

.... قرآن مجید نے اس مظلوم طبقے پر اس قدر احسانات کیے ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں اس نے سب سے پہلے اس بات کی تردید و تکذیب کی کہ عورت کا تعلق شیطان سے ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ عورت بھی اسی طرح ایک ذی رُوح اور قابلِ احترام مخلوق ہے جس طرح کہ مرد، کیونکہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ دونوں پر اپنے اعمال کی الگ الگ ذمّہ داری عاید ہوتی ہے اور کسی ایک کو دوسرے کے افعال کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

.... پھر اس کتابِ الٰہی میں عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی رُو سے عورت نہ تو کھلونا ہے اور نہ مرد کے لیے سامانِ عیش بلکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو

اُس کے لیے آرام و سکون کا نہایت مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق عورتیں ترکیبِ حیات میں مردوں کی مثل ہی ہیں یعنی انہی جیسی خواہشات، جذبات اور احساسات رکھنے والی مخلوق ہیں۔ دوم یہ کہ ان کی غایتِ آفرینش یہ ہے کہ وہ مَردوں کے لیے سرمایۂ راحت و تسکین و باعثِ سکونِ خاطر ہیں۔ سوم یہ کہ مرد اور عورت کے تعلقات کی بنیاد باہمی محبّت، اخلاص اور ہمدردی پر ہونی چاہیے۔ قرآن مجید نے عورت کو شیطان کی اولاد، چڑیل، مرد کو گناہ کی ترغیب دینے والی یا اُس کی کنیز نہیں ٹھیرایا بلکہ اسے اس کی اُنیس اور رفیق قرار دیا ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۶۸ء)

ایمان اور اس کے بنیادی تقاضے

ایمان کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں اور کسی شخص کا ایمان اس وقت تک اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا دنیا کی ہر دوسری چیز کے مقابلے میں مقدم نہ جانے اور اس کے حصول کے لیے تگ و دو اس کا سب سے بڑا سرمایہ حیات نہ بن جائے۔ اس معیار سے ہی اس کے اخلاص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم اس بارے میں لکھتے ہیں:

.... کلمہ طیبہ میں اثبات سے پہلے جو نفی رکھی گئی ہے وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب تک جھوٹے خداؤں کا ابطال نہیں کیا جاتا، ان کی محبت سے دل خالی نہیں ہوتے اس وقت تک خدائے برحق کے ساتھ تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ نفی کا یہ حصّہ غیر معمولی طور پر معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا کے اقرار سے پیشتر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ اس ایک معبودِ حقیقی کے علاوہ باقی سارے معبود باطل ہیں۔ آپ اگر انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور ان کی مخالفت کرنے والے افراد اور گروہوں کے طرزِ عمل کا تجزیہ

کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ لوگ جس بات پر مشتعل ہوتے تھے وہ خدا کے وجود کا اقرار نہ تھا بلکہ اس اقرار کے ساتھ جب اس کے عملی تقاضے سامنے آتے اور یہ اقرار ان سے اس بات کا مُطالبہ کرتا کہ وہ ان سارے بُتوں کی نفی کریں جن کو انھوں نے معبود بنا رکھا تھا، خواہ وہ پتھر کے بُت ہوں یا قوم و وطن کے بُت یا نسل و رنگ کے بُت یا مادی مفادات اور نفسانی خواہشات کے بُت، تو اس وقت ان کی طبیعتوں میں ہیجان پیدا ہوتا تھا اور وہ ان مُقدّس ہستیوں کو مٹانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کا مجرّد اقرار تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی جس سے دنیا میں اتنی شدید کشمکش برپا ہوتی اور اللہ تعالےٰ کے لاتعداد بندوں کو ہر دَور میں غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ گمراہ افراد اور باطل گروہ اقرارِ خدا پر اس وقت بھڑکتے ہیں جب اس کے عملی مطالبات اور تقاضے سامنے آتے ہیں۔ اور وہ دیکھتے ہیں کہ اس اقرار کے نتیجے میں انھیں خود کن مفادات سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ انھیں اپنے نظامِ فکر و عمل میں کیا تبدیلیاں کرنی پڑیں گی اور انھیں اپنے معاشرتی، معاشی اور اجتماعی ڈھانچوں میں کیا تغیّرات لانے پڑیں گے۔

اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ہر فرد اور ہر گروہ کی آزمائش ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ کی یہ سُنّت ہے کہ ایمان کے دعوے کرنے والوں کے ایمان جانچنے کے لیے اُن سے اس چیز کو قربان کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو انھیں سب سے زیادہ عزیز ہو کیونکہ وہ جب تک اُس قربانی پر آمادہ نہ ہوں اس وقت تک وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ بندگیٔ رب کے دعوے میں مخلص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں سے مختلف مطالبات کیے گئے۔ اگر ایک قوم بُتوں کی پرستار تھی اور اس کا دل مٹی کی مُورتیوں میں اٹکا ہُوا تھا تو اسے یہ کہا گیا کہ اللہ پر ایمان کے ثبوت میں سب سے پہلے اپنے دل کو ان کی محبت سے پاک کرو۔ اگر کوئی قوم حیلہ جُو تھی اور وہ فریب کاریوں

کے ذریعے اپنے مفادات پر کوئی آنچ نہ آنے دیتی تھی تو اُس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ تم سب سے پہلے اپنی اس ذہنیت کو بدلو اور مفادات کے بُت کو اپنے ہاتھ سے پاش پاش کرو۔ اگر کسی قوم کی گھُٹی میں بے حیائی پڑی ہُوئی تھی اور وہ اپنی نفس پرستی پر جان دیتی تھی تو اس سے دُوسرے سارے تقاضوں سے پیشتر اس امر کا تقاضا کیا گیا کہ تم اس کی پرستش کو تیاگ دو۔ کیونکہ جب تک تم اس الٰہ کا ابطال نہیں کرتے تم سچے خدا پر ایمان کے دعوے میں مخلص نہیں ہو سکتے۔ پھر جو قوم لین دین میں کھری نہ تھی اور مختلف نوعیت کی دھوکہ بازیوں سے ناجائز مال حاصل کرنے کی عادی تھی اُسے سب سے پہلے اس سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔ جس قوم نے دولت کو اپنا مقصود و مطلوب بنا رکھا تھا اُس کے لیے آزمائش یہ رکھی گئی کہ وہ سب سے پہلے اپنے دل سے اس تیرگی کو دُور کرے جو دولت پرستی کی وجہ سے دل کی دُنیا کو تاریک کر دیتی ہے کیونکہ جب تک یہ تیرگی دُور نہ ہو ایک قلب ایمان کے نور سے کس طرح منور ہو سکتا ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۸ء)

آگے چل کر خدا کی بندگی سے عاری انسان کی تصویر کشی کرتے ہوئے مرحوم فرماتے ہیں:

.... جس طرح مختلف صنم خانوں میں مُورتیوں اور بُتوں کی شکلیں ان کے تراشنے اور بنانے والوں کے ذوق کے اختلاف کی وجہ سے جُدا جُدا ہوتی ہیں بالکل اسی طرح انسانوں نے بھی اپنے دل کے صنم خانوں میں جو بُت سجا رکھے ہیں ان کی نوعیّت بھی ایک سی نہیں ہوتی۔ ہر فرد کا صنم خانہ اُس کے اپنے تعصبات کے بُتوں اور اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی مورتیوں سے آباد ہوتا ہے۔ جب جبینِ نیاز خدا کی بارگاہ میں جُھکنے سے احتراز کرے تو پھر کوئی ایک چوکھٹ نہیں رہتی جس پر جُھک کر کوئی فرد اپنے احساسِ عبُودیت

کی تسکین کر سکے۔ پھر تو وہ ہزاروں چوکھٹوں پر جھکنے کے لیے بیتاب رہتی ہے۔ وہ کبھی حکمرانوں کی چوکھٹ پر جھکتی ہے، کبھی قوم اور وطن اور کبھی رنگ و نسل کے بُتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے اور کبھی مادی مفادات اور اغراض کی مورتیوں کے حضور میں اظہارِ بندگی کرتی ہے۔ جب انسان ایک خُدا کی غلامی کو ترک کر دے تو پھر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خدا اس سے بندگی کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں اور وہ ان کی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۸ء)

قوّتِ ایمانی

اُمتِ مسلمہ کی سب سے عزیز متاع قوتِ ایمانی ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر مسلمان قوم دوسری تمام اقوام سے ممتاز ہے اور اسی جوھرِ گراں بہا سے اُسے عروج حاصل ہُوا۔ آج مسلمان قوم جس ذلت سے دوچار ہے اس کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ مسلمان قوم اس گنجِ گراں مایہ سے محروم ہو چکی ہے۔ قوتِ ایمانی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مرحوم فرماتے ہیں:

•••• وہ محکم چٹان جس کی بنا پر ایک قوم اپنی ہستی کو دُنیا میں قائم رکھ سکتی ہے اور دُنیا کی ہر اس رَو کو جو اسے اپنے ساتھ بہائے جانے کے لیے آگے بڑھے ناکام و نامُراد بنا دیتی ہے، اس قوم کی قوتِ ایمانی ہے جس قدر یہ قوت زیادہ ہو گی اسی قدر اس قوم کے اندر ہر سیلاب کے مقابلہ کرنے کی استعداد بھی زیادہ ہو گی۔ دنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی ایمان کی حرارت سے خالی ہو۔ تاریخ پر ایک عمومی نگاہ ڈال لینے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قوموں کی بقا اور ترقی میں اس قوت نے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کسی قوم کی زندگی اس کی قوتِ ایمانی سے وابستہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہو گا۔ یہ قوت نہ صرف ایک فرد کے اندر سعی و جہد کا ولولہ

پیدا کرتی ہے بلکہ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں ایک راہ پر لگاتی ہے۔ پھر اس کی مدد سے افراد کے مابین مودّت اور اخوّت کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور اس طرح معاشرتی زندگی کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس سے اجتماعی شعور کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اور مختلف قومیں اور ملتیں جنم لیتی ہیں۔ اس کی بدولت افراد اور اقوام میں عمل کی خواہش اور ترقی کی تڑپ پرورش پاتی ہے۔ یہ اسی قوت کا اعجاز ہے کہ لوگ ذاتی اغراض و منافع کی پرستش سے بلند ہو کر اجتماعی مفادات کی خاطر زندہ رہنا سیکھتے ہیں۔ جب یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر قومیں صفحۂ ہستی سے خود بخود مٹ جاتی ہیں اور کوئی خارجی سہارا انھیں زندگی عطا نہیں کر سکتا۔

یہ قوت چونکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے دُنیا کی کسی غاصب قوم نے جب بھی اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ایک کمزور قوم پر دستِ ظلم دراز کیا تو اس نے لگے بندھے منصوبے کے تحت اس امر کی کوشش کی کہ کِس طرح مفتوح قوم کے فکر و نگاہ کو بدل دیا جائے کیونکہ اس کے تبدیل ہو جانے سے پھر اس کا مقصد باآسانی حل ہو سکتا ہے۔ "تیر و سناں" افراد کو موت کے گھاٹ تو اتار سکتے ہیں مگر قوموں کو فنا نہیں کر سکتے۔ قوموں کو دنیا سے نیست و نابُود کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انھیں اس گنجِ گراں مایہ سے محروم کر دیا جائے جس کے بل بوتے پر ان کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے اور جس کے لُٹ جانے کے ساتھ ہی وہ قومیں نہیں رہتیں بلکہ بے ضمیر انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ بن جاتی ہیں جنھیں استعمار کی قوت جس طرف چاہتی ہے بے زبان جانوروں کی طرح بالکل میکانکی طور پر ہانک کر لے جاتی ہے۔

پھر اُمتِ مسلمہ کے حق میں اس "نسخۂ کیمیا" کو تو خاص طور پر آزمایا گیا ہے۔ وہ لوگ جو اس قوم کے مزاج سے واقف ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کی تشکیل و ترتیب میں خاک و خُون کے مادی رشتوں اور خاندانی، قبائلی اور گروہی تعصبات اور نسلی یا ملکی مفادات کا قطعاً کوئی

دخل نہیں۔ اس کی قومیت کی اساس محض ایک تنزیہی تصوّر ہے جس کا تحقّق ملّتِ بیضا کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس بنا پر ایک تصور ہی یہاں ایک قوم کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اسی سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں مسلمانوں کے نزدیک ایمان کی حیثیت محض ایک مجموعہ افکار کی نہیں بلکہ یہ اس قوم کا مبدأ اور احساس ہے۔ مسلمان جب تک مسلمان ہیں کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کریں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کرلیں جو اُن کے مذہبی احساسات و تخیّلات سے بالکل مغائر ہو۔ اگر دنیا کی کوئی قوم قوت وطاقت کے بل بوتے پر یا چالبازی اور عیّاری کے سحر سے اس ملّت کو دین سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہوجائے تو سمجھ لیجیے کہ اس نے بازی جیت لی۔ کیونکہ دین کے رخصت ہوجانے کے بعد اس کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا کی جن جن قوموں نے مسلمانوں کو زیر کرنا چاہا وہ مدّت بھر کے تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے ہاتھوں سے تیغ وسناں کا چھین لینا اس قدر ضروری نہیں جس قدر کہ ان کے دل و دماغ سے متاعِ ایمان کی قیمت واہمیت کو کم کردینا ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۹ء)

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضے

انسانی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا تھا جب دُنیا روحانی و اخلاقی انحطاط کی تاریکیوں میں گھر چکی تھی۔ کفر و شرک، فسق و فجور، الحاد و زندیقیت اور ظلم و استبداد کے چہار سو اندھیرے پھیلے ہوئے تھے اور گم گشتہ راہ انسانیت ان ظلمت کدوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ خالقِ کائنات کو انسانیت کی اس بے بسی پر ترس آگیا، اُس کی رحمتِ بے پایاں جوش میں آئی اور اس نے انسانیت کی راہنمائی کے لیے سراجِ مُنیر ﷺ بھیجا جس کی ضوافشانیوں سے کفر و ضلالت کے تمام اندھیرے

چھٹ گئے اور رُخِ انسانیت پر تابندگی پھیل گئی۔ ؎

وہ دانائے سبل، ختم رسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

مرحوم ایک سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ انھوں نے اپنی حیاتِ مستعار کا ایک ایک لمحہ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزارا اور اپنے قلم اور عمل سے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا حق ادا کر دیا۔ مرحوم نے یُوں تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر بہت کچھ لکھا اور ان میں سب سے نمایاں انگریزی زبان میں آپ کی کتاب "THE LIFE OF MUHAMMAD" ہے جو اندرون و بیرونِ ملک بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے، مگر آپ کی تحریروں میں سے درج ذیل اقتباسات کا انتخاب اس مقصد کے لیے کیا گیا ہے کہ قارئین عشقِ رسولؐ کے اصل مفہوم سے آگاہ ہو سکیں۔ یُوں تو ہم میں سے ہر شخص عشقِ رسولؐ کا دعوے دار ہے مگر ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو محبت کے کھوکھلے نعروں اور عشقِ رسولؐ کے جھوٹے دعووں کے بجائے بالفعل اتباعِ رسولؐ پر عمل پیرا ہیں۔ مرحوم کے نزدیک قوم میں سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نفوذ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ خود اللہ کے قانون قرآن مجید کا نفاذ۔ ؎

مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

.... ایک مومن و مسلم جس طرح خدا پر ایمان لا کر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اب وہ اپنی زندگی کی ساری خواہشات کو مرضیاتِ الٰہی کے تابع کر دے گا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے عمر بھر ہمت آزما رہے گا۔ یہی اس کی زندگی کی غایتِ اولیٰ ہو گی۔ اسی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی کا حق اسی طریق سے ادا کر رہا ہے جو اسے خدا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا ہے۔ ــــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تمام انبیاء علیہم السّلام کا ادب و احترام نہ کرے۔

ان کے سچے پیغمبر ہونے پر یقین نہ رکھے اور ان سے تعلقِ خاطر کو ایمان کا ایک نہایت ضروری جزو نہ سمجھے۔ جو کوئی بھی اللہ کے فرستادوں سے کدر رکھتا ہے، ان کے خلاف اپنے سینے میں کوئی بغض و عناد پالتا ہے، جو اُن کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہنے کی جسارت کرتا ہے، وہ دائرۂ اسلام سے یکسر خارج ہے لیکن ان حقائق کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ بفحوائے "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" اور بتقاضائے ختمِ نبوت ہم اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک منفرد اور امتیازی شان رکھتے ہیں۔

حضورؐ سید الانبیاء کی بعثت سے پہلے جتنے پیغمبر گزرے ہیں ان کی سیرتوں کا مقصد کسی ایک قوم کو خاص مُدّت تک راہنمائی دینا تھا۔ ایک زمانہ کے بعد بتدریج ان کی تعلیمات کے نقوش مدہم ہوتے گئے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ دُنیا سے بالکل ناپید ہو گئے اور ان کی حقیقت افسانوں میں گُم ہو کر رہ گئی۔

ان اولوالعزم انبیاء کی زندگیوں کے برعکس حضور ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا معمولی سے معمولی واقعہ آج بھی تاریخ کی پیشانی پر اسی طرح درخشندہ اور تابندہ ہے جس طرح کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا اور انسانیت کے قافلے جب کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ حیات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی تازگی دیکھ کر فوراً پُکار اٹھتے ہیں۔ ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

اس حوادث آباد عالم کا تغیر و تبدّل جس طرح اپنے سارے انقلابات کے باوجود خدا کی خدائی کو کسی طرح متاثر نہیں کرسکتا، وہ آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہے جس طرح لاکھوں کروڑوں سال پہلے تھی، بالکل اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بھی گردشِ لیل و نہار کسی جہت سے اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بھی زندہ جاوید ہے اور قیامت تک رہے گی۔ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد نجات کی اب صرف ایک صورت ممکن ہے کہ انسان اپنے دلوں کو مشکوٰۃِ نبوت سے منور کریں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی شخص ان کی نبوت کے علاوہ کسی دوسری نبوت کا قائل ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے دل میں شمعِ ایمان فروزاں نہیں بلکہ جل وفریب کی وہ چنگاری ہے جو شیطان انسانوں کے خرمنِ ایمان کو خاکستر کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً جلاتا رہتا ہے۔ انسانیت کی فوز و فلاح اب صرف سرورِ کائنات کی غلامی میں ہے۔ یہی ایک طوق ہے جس کو پہن کر وہ دنیا اور آخرت میں سرفراز ہو سکتا ہے۔ یہی اس کی سب سے قیمتی متاع ہے اور اسی پر ایک بندۂ مومن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

مرحوم کے نزدیک حُبِّ رسول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر بھی اتباعِ رسول کو زندگی کے ہر گوشے میں نافذ کرے ؎

معنیِ دیدار آں آخر زماں
حکمِ اُو بر خویشتن کردن رواں

چنانچہ مرحوم اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

.... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معنی صرف یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا محض زبان سے اقرار کر لیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کے بہت سے تقاضے ہیں۔ اس ایمان کی اصل روح یہ ہے کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہو۔ ہمیں اس بات کا کامل یقین ہو کہ آپؐ صادق اور امین ہیں۔ آپؐ کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت اور دانائی ہے۔ خواہ وہ حکمت اور دانائی ہماری سمجھ میں آ رہی ہو یا نہ آ رہی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو راہ انسانیت کو دکھائی ہے صرف اسی پر چل کر انسانیت کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ بشری کو زندگی کے جو اصول دیے ہیں وہ دائمی اور ابدی ہیں اور سخت نامراد ہے

وہ انسان جوان سے صرفِ نظر کر کے چلتا ہے۔ جب تک آدمی کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں اس قسم کا غیر متزلزل اعتماد پیدا نہ ہو۔ مجرّد یہ کہہ دینے سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، آدمی ایمان کی حقیقی لذّت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کرنا ہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے خود اپنی محبت کا معیار اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیا ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ۔

کہہ دیجیے کہ اگر تم کو خدا سے محبّت ہے تو میری پیروی کرو، خُدا بھی تم کو محبوب رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا۔

جو شخص ایمان کا دعویدار ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبّت کا دم بھرتا ہے اس کے دعوے کی صداقت کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ احکامِ الٰہی اور احکامِ رسولِ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچّے دل کے ساتھ پیروی کرتا ہے۔

• • • • رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت کے سلسلے میں پھر ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ صرف ہمارے جذبات، احساسات ہی تک محدود نہ ہو بلکہ اسے ہماری زندگی کے سارے پہلوؤں پر محیط ہونا چاہیے۔ ہماری حیات کا کوئی گوشہ، ہمارے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اس کی فرماں روائی سے آزاد نہ ہو۔ اس محبّت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہمارے افکار و نظریات، ہمارے اعمال و افعال، ہماری سیرت و کردار سب میں نہ صرف اس کے اثرات نمایاں ہوں بلکہ ان سب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی گہری چھاپ ہو، وہ سب تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اسلام میں وہ محبّت

بالکل بے معنی ہے جس کے پیچھے کامل اطاعت اور مکمل اتباع کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

.... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا رشتہ کس قدر گہرا اور پائیدار ہے اور یہ دُوسرے سارے رشتوں پر کس قدر حاوی ہے۔ سخت نادان ہیں وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو صرف کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلق سے تعبیر کرتے ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی معتمد ہرکارے کی حیثیت دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف ابلاغِ حق ہی نہیں تھا بلکہ اس کا نفاذ اور قیام بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مُقدس اس دین کی عملی تشریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک قاصد سے کہیں زیادہ بڑھ کر ایک مُعلّم، ایک مُزکّی، ایک مُرشد، ایک مُبین، ایک مُبشّر، ایک مُنذر اور ایک سراجِ مُنیر ہیں۔ کلامِ الٰہی جس پیکرِ محسوس میں اپنی مکمل ترین صورت میں جلوہ گر ہوا ہے وہ حضور سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی ہے۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مختلف حیثیتیں صرف آپؐ کے زمانے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ قیامت تک اسی طرح رہیں گی۔ جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں اس وقت تک انسانیت کی سعادت انہی کی بلا چون و چرا اطاعت سے وابستہ ہے۔ جس چیز کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کہہ دیا وہ وقت کے ہزار اختلاف کے باوجود ہمیشہ حق ہی رہے گی اور جسے آپؐ نے باطل قرار دیا اسے گردشِ ایام کبھی حق میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کوئی ایسی چیز نہیں جس کی راہ میں زمانہ کی دیواریں حائل ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ابدی اور آفاقی ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالکل ماورا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی ایک مسلمان کے لیے اسی طرح ہادی اور مطاع ہیں جس طرح اپنی زندگی میں تھے۔ ایک انسان خواہ کسی دور اور کسی مُلک کا رہنے

والا ہو اس وقت تک مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چاکری اختیار نہ کرے اور پھر اس پر کسی قسم کا انقباض اور تنگی محسوس کرنے کے بجائے اسے اپنے لیے ہر لحاظ سے خیر و برکت نہ سمجھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی ایک مسلمان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ایسا سرمایہ جس کو حاصل کر لینے کے بعد وہ ایمان ایسی عظیم نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں اسی امر کی وضاحت میں کہا گیا ہے:

مَن اطاع مُحمّدًا فقد اطاع اللہ ومَن عصیٰ مُحمّدًا فقد عصیٰ اللہ ومُحمّد فرق بین النّاس (بخاری)

"جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی (اللہ کے ماننے اور نہ ماننے والے) لوگوں کے درمیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نشانِ امتیاز ہیں۔"

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفےٰ گیر،
اگر باور نداری آنچہ گفتم
ز دیں بگریز و مرگ کافرے میر

(ایمان اور اخلاق)

اسلام میں صبر و ضبط اور تسلیم و رضا کی اہمیت

فقر و ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینم ایں متاعِ مصطفےٰ است

انسان زندگی کی پُر پیچ راہوں میں کبھی تو فتح مندی اور کامرانی کی منزلوں سے ہمکنار ہوتا ہے تو کبھی غم اور ناکامیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ غرض مختلف طریقوں سے خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور خدا کا فرمانبردار بندہ

اُس کے فضل و کرم کے سہارے زندگی کی ان راہوں میں نہ تو مسرتوں پر اس قدر خوش ہوتا ہے کہ جو اسے یادِ الٰہی سے غافل کر دے اور نہ ہی ناکامیوں پر اس قدر مایوس ہوتا ہے کہ صبر و ضبط کو ہاتھ سے چھوڑ دے بلکہ وہ دُنیا کے مصائب و شدائد کو ایک آزمائش سمجھتا ہے اور بڑی ثابت قدمی سے رضا و تسلیم کے ساتھ انھیں برداشت کرتا ہے۔ مرحوم فرماتے ہیں :

•••• اللہ پر توکّل ایک ایسی سیرت و کردار کی صُورت گری کرتا ہے جس کے اگرچہ بے شمار مظاہر ہیں لیکن اس کی نمایاں صفت صبر اور تسلیم و رضا ہیں۔ ایک مومن جب اپنی زندگی کا واحد سہارا اللہ تعالیٰ کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کی حالت اس مُسافر کی سی ہو جاتی ہے جسے نہ تو کنارہ چھُوٹنے کا غم ستاتا ہے اور نہ کف بدہن موجیں اُسے ہراساں اور پریشان کرتی ہوں۔ فتح مندیاں اور کامرانیاں جب اس کے قدم چُومتی ہیں تو وہ اتراتا نہیں بلکہ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور اسی طرح ناکامیاں اور نامُرادیاں اُس کے حصے میں آتی ہیں تو وہ نوشتۂ ایزدی پر برہم ہونے کے بجائے صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور مالک الملک سے دست بدعا ہوتا ہے کہ وہ حالات کا رُخ پھیر دے۔ اگر اس معاملہ کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر یا تسلیم و رضا ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے توکّل علی اللہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے خالق اور مالک کا جس قدر زیادہ مُعتقد ہوگا، اُسی تناسب سے اس میں تسلیم و رضا موجود ہوگی۔ صبر و ضبط یا تسلیم و رضا اللہ پر توکّل کی عملی تعبیر ہے۔ جو چیز عقیدہ کی شکل میں توکّل علی اللہ کہلاتی ہے وہی جب انسانی اخلاق میں جلوہ گر ہوتی ہے تو صبر یا تسلیم و رضا نام پاتی ہے۔ یہ صفات انسان کے اندر اس وقت تک موجود رہیں گی جب تک کہ اُسے اپنے خدا پر یقین اور بھروسہ ہے۔

•••• اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام نے صبر و ثبات کو کیوں غیر معمولی اہمیّت دی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیابی

کے مراحل سے گزارنے کے لیے صبر و ضبط ہر حال میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور دنیا کی ہر قوم نے اس صفت سے متصف ہو کر ہی اس دُنیا میں فلاح و کامرانی حاصل کی ہے مگر اسلام میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے کیوں کہ یہاں ایک طرف تو منزلِ مقصود ایک غیر مرئی ذات کی رضاجوئی ہے اور دُوسرے اس ذات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو معیارات قائم کیے گئے ہیں وہ بھی ایسے نہیں کہ انھیں حواس کے پیمانوں سے ماپا جا سکے۔ ان کو وزن کرنے کے لیے ایک دُوسری میزان اور دُوسرا مقوم ہے اور وہ ان کا دینی نفع اور اُخروی اجر ہے۔ ایک مسلمان جب اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا رب اللہ ہے اور وہی بلاشرکت غیرے اُس کا خالق، مالک اور فرمانروا ہے تو پھر اسے صادق القول ثابت ہونے کے لیے مختلف آزمائشوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی اُس پر رزق کے دروازے کُشادہ کر دیے جاتے ہیں اور وہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ ان مادی وسائل اور اسباب کو اپنا الٰہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کا امین ہے اور انھیں صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ہی خرچ کرتا ہے۔ کبھی اسے تنگی اور مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے عمل سے یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیاوی مصائب اصل مقصد سے اسے باز نہیں رکھ سکتے بلکہ مقصد کے ساتھ وابستگی کو اور بڑھاتے ہیں۔ کبھی راستے کی مشکلات خود بخود اس پر کھول دی جاتی ہیں مگر ایک مسلمان اسے اپنے تدبّر اور تفکر کی کرشمہ سازی سمجھنے کے بجائے اسے فضلِ ایزدی سمجھتا ہے اور اگر کبھی مصلحتِ الٰہی اس کی راہ میں سنگِ گراں حائل کر دیتی ہے تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تائیدِ ربّانی کے بھروسے سے ان پر غالب آنے کی سعی کرتا ہے۔ غرض مختلف طریقوں سے خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور خدا کے یہ فرمانبردار بندے اس کے فضل کے سہارے زندگی کی ان پُرپیچ راہوں میں ثابت قدم رہ کر اپنی متاعِ ایمان کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

• • • صبر کے معنی صرف یہ نہیں کہ آدمی مصائب کو برداشت کرے

اور بیقرار نہ ہو بلکہ اس میں تسلیم و رضا کا عنصر بھی شامل ہے۔ ایک داعئ حق کا فرض ہے کہ اس دعوت کی راہ میں جو مصیبتیں اور مشکلات آئیں انھیں خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کرے اور یہ یقین رکھے کہ جب اللہ تعالےٰ مناسب سمجھے گا تو وہ ان تکلیفات کو خود بخود دُور کر دے گا۔

• • • • مصائب کے پیش آنے پر تسلیم و رضا کے طرزِ عمل کا ایک ذرا گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر کی یہی کیفیت تو درحقیقت ایمان باللہ کی جان ہے۔ یہی چیز ایک خدا پرست کو مادہ پرست سے ممیّز کرتی ہے۔ مادہ پرست انسان کے فکر کا رقاص چونکہ مادہ کے محور پر گھومتا ہے اس لیے وہ زندگی کے سارے مصائب کی علّتِ غائی صرف مادی حالات کی ناموافقت کو قرار دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تکلیفات نے اگر اُسے گھیرا ہے تو اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ حواس کی دُنیا اور اس کے مال و اسباب کو اپنے لیے کارآمد بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ زندگی کے شدائد و مصائب میں ایک گہری حکمت و دانائی دیکھتا ہے۔ وہ ان سے عبرت پکڑتا ہے۔ اُس کے نزدیک مسرّت و غم، آرزوؤں کی کشمکش، انسانیت کی کامرانیاں اور مسرّتیں، قوموں کے عروج و زوال مادی حوادث کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ یہ سب اللہ کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پیچھے ایک زبردست مدبّر کی تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان خارجی حوادث کے پس پردہ جھانک کر اس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے جس کے دراصل یہ سارے مظاہر ہیں اور پھر اپنے آپ کو بالکل رضاکارانہ طور پر اس حقیقت کے تابع کر دیتا ہے۔ یہی معراجِ انسانیت اور کمالِ آدمیت ہے یہی چیز ایک مومن کے قلب کو طمانیت کے نُور سے بھر دیتی ہے۔ اس کے ذہن کو آفاقیت، نگاہوں کو بلندی اور علم کو وسعت عطا کرتی ہے۔ یہی مقام ہے جس پر پہنچ کر ایک انسان پٹ کر ہنستا ہے، گر کر سنبھلتا ہے اور مصائب

کے ہجوم میں گھر کر بھی اپنے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔
(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۵۸ء)

اسلام میں عورت کا مقام اور خاندانی نظام

جو شخص اسلامی تعلیمات سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا ہے کہ خاندانی نظام کو مستحکم بنانے کے لیے عورت کا وجود ازبس ضروری ہے۔ وہ ہوٹلوں، رقص گاہوں، سینما گھروں کی رونق میں اضافہ کرنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی بلکہ اس کا اصل مقام گھر کی چار دیواری ہے جہاں وہ مرد کی مونس وغمخوار اور اپنے بچوں کی تربیت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اسلام عورت کو "شمعِ محفل" کے بجائے "چراغِ خانہ" دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں مرحوم فرماتے ہیں:

.... اسلام انسان کے لیے عفّت، پاکدامنی، شرم وحیا کو ضروری صفات سمجھتا ہے چونکہ ان صفات کی بنیاد پر ہی ایک مستحکم خاندانی نظام تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے ہر اُس کام سے انسان کو دُور رہنے کی ہدایت کی ہے جس سے مذکورہ صفات کو نقصان پہنچ سکتا ہو اور ہر اس فعل کی تائید کی ہے جس سے یہ اوصاف ایک فرد کے اندر پرورش پائیں۔ ظاہر بات ہے کہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول ان صفات کو برقرار نہیں رکھ سکتا بلکہ ان کی ساخت و پرداخت کے لیے ضروری ہے کہ زیب وزینت اور نگاہ کے استعمال پر معقول قسم کی پابندی عائد کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اگر اسلام نے ایک طرف جنسی آوارگی کی ساری راہوں پر پہرے بٹھائے ہیں تو دُوسری طرف اس بات کا بھی پُورا پُورا خیال رکھا گیا ہے کہ جائز طریقوں سے ہر شخص اپنی صنفی خواہش کی تسکین کر سکے۔ پھر اُس نے اس صنفی تعلق کو بعض اخلاقی ضابطوں کا پابند بنا کر اس پر خاندانی نظام کی رفیع الشان عمارت اٹھائی ہے۔ اس وجہ سے ایک مسلمان کا اپنی بیوی کے ساتھ رشتۂ مناکحت صرف صنفی جذبہ کے تحت ہی استوار نہیں ہوتا بلکہ اس رشتے

میں بہت سے اخلاقی اور رُوحانی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ رشتہ شرم وحیا کے پاکیزہ احساسات بیدار کرتا ہے اور عائلی زندگی کو اس قدر مامون ومحفوظ رکھتا ہے کہ کسی شخص کا طائرِ وسوسہ بھی کسی خاتون کے حریمِ عصمت کی طرف پرواز نہیں کر سکتا۔ اس سے خاندانی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں۔ انسان کے دل میں تقوےٰ اور پرہیزگاری کے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے اور اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو حدود اللہ کا پابند بنائے۔ پھر اسی رشتہ سے ایثار اور مودّت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ بڑوں کے لیے عزّت واحترام اور چھوٹوں کے لیے شفقت ومحبّت کے احساس پرورش پاتے ہیں اور پھر جب یہ احساسات و جذبات معاشرے کے رگ وپے میں اچھی طرح سرایت کرجاتے ہیں تو ان سے جو ماحول پیدا ہوتا ہے اس میں پرورش پانے والے لوگ خود بخود سیرت وکردار کے اُن سانچوں میں ڈھلے چلے جاتے ہیں جو اسلام نے انسان کے لیے تیار کیے ہیں۔ یہ فضا از خود لوگوں کے دلوں میں اسلامی اقدارِ حیات سے وابستگی اور شیفتگی پیدا کر دیتی ہے۔

(اشارات، ترجمان القرآن جنوری ۱۹۶۵ء)

•••• اسلام عورت کو "شمعِ انجمن" بنانے کے بجائے "چراغِ خانہ" بنانا چاہتا ہے۔ اس نے انسان کی اخلاقی تربیت پر بڑا زور دیا ہے اور اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ گھر کا ماحول جو بچے کی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم فطری مکتب ہے وہ اسلام کی اخلاقی شعاعوں سے پوری طرح روشن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے گھر کی چار دیواری کو اخلاق و رُوحانیت کے نُور سے منوّر کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر عورت پر ڈالی ہے اور اس اہم فرض کی ادائیگی کا اسے ہی ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔

•••• گھر کی چار دیواری ہی انسانی معاشرے کی وہ بُنیادی اکائی ہے جس کے اثرات کسی سوسائٹی بلکہ پُوری انسانیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام

ہے جہاں انسان آنکھ کھولتا ہے اور یہی وہ ماحول ہے جس کے اچھے یا بُرے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کی صاف لوح پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر گھریلو ماحول شرافت اور اخلاقِ صالح سے معمور ہوگا تو اس کے صحت مند اثرات بچے کے ذہن پر لازماً پڑیں گے بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ بچپن کے غیر محسوس تاثرات انسان کے قلب و دماغ پہ تاحین حیات قائم رہتے ہیں۔ مگر گھریلو ماحول کی پاکیزگی اور صحت کا زیادہ تر دارومدار عورت یا زیادہ صحیح الفاظ میں ماں پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عورت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شوہر کے گھر کی حکمران کہا ہے۔

عورت اسلامی نقطہ نظر سے محض مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ ایسی بلند ہستی ہے جو اسلامی معاشرے کی بنیادوں کی حفاظت اور پاسبانی کرتی ہے۔ وہ معاشرہ کی ذمہ دار رُکن ہے، اس کے ذمے چند بنیادی فرائض ہیں۔

____ وہ اسلامی اخلاق کی ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ فعّال رُکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان اہم ذمہ داریوں کی بجا آوری عورت اسی صورت میں کر سکتی ہے جب وہ دلجمعی کے ساتھ گھر میں بیٹھ کر اولاد کی تربیت پر پوری توجہ صرف کرے۔ اس بنا پر اسلام نے اسے گھر سے باہر کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حافظ ابوبکر بزّار حضرت انس رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مسلمان خواتین نے بارگاہِ نبوّت میں عرض کی کہ حضورؐ ساری فضیلت تو مرد لوٹ لے گئے۔ وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل جائے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پا لے گی"۔

عورتوں کے لیے گھر میں بیٹھنے کی تاکید معاذ اللہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اسلام عورتوں کو قیدی کی حیثیت سے گھروں میں مُقیّد رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس نے اسے یہ حیثیت تقسیمِ کار کے طور پر دی ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ شدید ناانصافی

ہے کہ عورتیں گھر کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ براہوں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ضروریات کی فراہمی کے لیے مردوں کے دوش بدوش دفتروں، کارخانوں ہوٹلوں اور صنعت وتجارت کے دوسرے اداروں میں کام بھی کریں۔ اسلام نے عورت کو گھر کے سکون اور آرام اور گھر کی فضا کو اخلاق وشرافت کا نمونہ بنانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اُس نے عورت اور اس کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے۔ فطرت نے جس طرح مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں فرق رکھا ہے اسی طرح ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھی الگ الگ رکھا ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن مئی ۱۹۶۶ء)

اسلام اور معاشی تحفظ

آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی زبوں حالی کا ہے۔ وہ اس کے حل کے لیے ہمیشہ سرگرمِ عمل رہا ہے اور آج بھی معاشی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ مرحوم کے نزدیک اس کا حل صرف اسلام کا متوازن اور عادلانہ معاشی نظام ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

•••• اسلام نے انسان کے فقروفاقہ اور معاشی زبوں حالی کے حل کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ نہایت متوازن اور مُعتدل ہے۔ وہ معاشرہ اور فرد دونوں کی ضروریات واحتیاجات کو ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ نہ تو معاشرہ کو اتنے قاہرانہ اختیارات دیتا ہے کہ فرد کی ذات مسخ ہو کر رہ جائے، اس کی ذہنی وجسمانی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں، اس کی آزادیِ عمل سلب ہو جائے اور اس کی محنت اور سعی وجہد کے ثمرات سے وہ محروم کر دیا جائے اور نہ فرد ہی کو اتنی آزادی دیتا ہے جس سے دُوسرے افراد کی آزادی مجروح ہوتی ہو۔ ایک طرف وہ ہر فرد کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کے ثمرات سے بھرپور متمتع ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کے ثمراتِ

محنت و کاوش کو تقدس بخشتا ہے اور کسی کو ان میں دست درازی کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسری طرف وہ فرد کو کسی کی حق تلفی اور کسی سے دجل و فریب کا مرتکب ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف وہ انسان کے قلب و ذہن کی تطہیر کرتا ہے اور اس کے اندر اخوّت و محبّت، ایثار و ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کرتا ہے اور لوگوں سے احسان (حُسنِ سلوک) کی ترغیب دلاتا ہے اور دوسری طرف بے بس، معذور اور ناتواں لوگوں کی عملی دستگیری کے لیے اہلِ ثروت لوگوں کی دولت میں ان کا حق متعین کرتا ہے۔ ارتکازِ زر کے استیصال کے لیے ایک طرف سُود کو حرام قرار دیتا ہے تو دُوسری طرف زکوٰۃ اور وراثت کے ذریعہ دولت کی منصفانہ تقسیم کا اہتمام بھی کرتا ہے اسلام اگر اہلِ سرمایہ کو اپنے مُلازموں اور مزدوروں کی فلاح و بہبُود کا حکم دیتا ہے تو دُوسری طرف مزدوروں اور مُلازموں کو بھی اپنی ذمہ داریاں، امانت و دیانت سے سرانجام دینے اور اپنے مالک سے خیرخواہی کے جذبات رکھنے کا پابند کرتا ہے، چنانچہ اسلام کا نظامِ معیشت اخوّت و محبّت اور صحت کا پیغام ہے جو باہمی منافرت اور طبقاتی کشمکش کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتا اور جو انسانیت کو حقیقی امن و سکون سے ہمکنار کرتا ہے۔

(دیباچہ، اسلام اور معاشی تحفظ)

مادی تہذیب اور اس کے اثرات

دنیا میں آج تک جتنی بھی مادی تہذیبیں اُبھری ہیں ان کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس مادی ترقی نے آج کے انسان کو آرام و سکون کی زندگی فراہم کرنے کے بجائے اس کی تباہی و بربادی کا سامان مہیا کیا ہے۔ انسانیت ایک وسیع برادری کی حیثیت سے زندہ رہنے کے بجائے مختلف دھڑے بندیوں کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ نوعِ بشری

کے افراد نے ایک دُوسرے کی معاونت اور دستگیری کرنے کے بجائے ایکدوسرے کا گلا کاٹنا اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دیا ہے۔ دُنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان آج جو عداوت اور دشمنی پائی جاتی ہے اُسے دیکھتے ہُوئے کیا کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کرسکتا ہے کہ یہ مادی ترقی انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہے۔ مادی تہذیبوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مرحوم لکھتے ہیں :

.... آپ اگر گزشتہ دوسو سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اس امر کی پوری تصدیق ہو گی کہ انسان نے بھاپ کے دبو کو مُسخّر کر کے اس سے اس غرض کے تحت کام لینا شروع کیا تاکہ پیدائش دولت میں غیر معمولی اضافہ ہو۔ اضافہ تو بلاشُبہ ہُوا مگر انسان کو اس اضافے سے کیا حاصل ہُوا؟ وسیع پیمانے پر بیروزگاری، مزدُور کی آزادی کا خاتمہ، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، طبقاتی کش مکش، استعماریت کی سمرانی، خاندانی نظام کی بربادی، اخلاقی اقدار کی پامالی اور جرائم کی زیادتی۔ اگر کثیر پیداواری اور زوُد پیداواری کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو بحیثیتِ مجموعی فائدہ حاصل ہو تو کوئی صاحبِ بصیرت بھی موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مادی تہذیب اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی ہے۔

.... انسان نے پانی کی یلغار کو روک کر اس سے بجلی پیدا کی، فضاؤں میں اُڑ کر اپنی بالادستی کو تسلیم کروایا۔ انسان کے یہ کارنامے واقعی حیران کُن ہیں۔ پانی کی بپھری ہُوئی قوت سرنگوں کی گئی اور دیوہیکل مشینری متحرک کرنے میں استعمال کی جانے لگی، آسائشاتِ زندگی میں اضافہ ہُوا مگر ان مشینوں نے احساسِ مروّت کو بالکل کُچل کر رکھ دیا۔ کارخانہ داروں نے انسان کو انسان سمجھنے کے بجائے اسے مشین کا بالکل بے حس پُرزہ سمجھ کر اس سے معاملہ کیا۔ اس کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہے، وہ اپنے اندر کوئی ضمیر نہیں رکھتا۔ وہ عزّتِ نفس کے احساس

سے یکسر محروم ہے۔ وہ لوہے کی مشین کی طرح گوشت پوست کی محض ایک مشین ہے جس پر کم سے کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہیے کیونکہ یہ انسانی مشین تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں، اس بنا پر انھیں معمولی رقم کے بدلے بڑی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

• • • • (مغربی مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ) انسان مشین سے گھٹیا سمجھا گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو مشین ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ قدرت نے اسے ایک خود کار مشین بنایا تھا مگر اس کی حماقت دیکھیے کہ اس نے خواہ مخواہ اپنے دل و دماغ کے اندر مذہبی معتقدات پال کر اور اخلاقی اور رُوحانی احساسات کو پرورش کر کے غیر مشینی روش اختیار کر لی، نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک بے حس مشین بننے میں ناکام رہا اور اس بنا پر لوہے کی مشین کے مقابلے میں اسے شکست کھانا پڑی۔ ان میں سے ایک مفکرؔ نے اسے یہ بتایا کہ وہ غلطی سے اپنے آپ کسی اعلیٰ و ارفع ذات کا اس زمین پر خلیفہ سمجھ رہا ہے۔ درآنحالیکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے محض حیوان ہے اور حیوان ہی سے اس نے چند ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ شکل و صورت اختیار کی ہے۔ اس بنا پر اس کی حقیقی احتیاج مذہب و اخلاق نہیں بلکہ حیوانی ضروریات ہیں۔ اسے پیٹ بھر کر کھانا اور صنفی جبلّت کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل اور آزادی چاہیے۔ اخلاق اور رُوحانیت کی سب باتیں غیر فطری ہیں جو اس کے مزاج سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ اس کے فطری طرزِ عمل میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ مغرب کے انسان نے اس عجیب و غریب نظریے سے نہایت گہرا اثر قبول کیا اور جلد ہی یہ باور کر لیا کہ وہ واقعی حیوان ہے اور یہ مذہب، اخلاق اور رُوحانیت سب بیکار باتیں ہیں۔ انسان پر جس وقت اپنی حیوانیت کا راز کھُلا تو پھر اس نے اپنے عمل کے محرکات کا از سرِ نو جائزہ لینا شروع کیا اور تحقیق کے ایسے نوادر پیش کیے کہ عقلِ سلیم سر پیٹ کر رہ گئی۔ اس نے انسان کو یہ باور کرایا کہ عمل کا اصل

محرک ایک ہی ہے اور وہ بھوک ہے جو دو صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پیٹ یا صنفی خواہش۔

•••• دورِ جدید کے معاشرتی اور معاشی نظام کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج جو فکر ان پر سب سے زیادہ مسلّط نظر آتی ہے وہ فکرِ معاش ہے۔ جس انسان کو بھی دیکھیے اس کے لیے معاش کا مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔ اس مسئلے میں انسان کو جان بوجھ کر اُلجھایا گیا ہے تاکہ فکرِ معاد اسے کسی طرح اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ جدید انسان معاشی الجھنوں ہی میں گرفتار نہیں بلکہ سیاسی اور معاشرتی پیچیدگیاں بھی ہر وقت اس کے لیے دردِ سر بنی رہتی ہیں اور وہ بیچارا انھیں حل کرنے ہی میں عمرِ عزیز صرف کر دیتا ہے مگر اسے معمولی کامیابی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آپ مثال کے طور پر انصاف کو ہی لیں۔ کسی معاشرے میں انصاف کا حصول چونکہ ہر فرد کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے اسے ہوا اور پانی کی طرح ارزاں اور اس کا طریقِ کار سورج سے زیادہ واضح اور روشن ہونا چاہیے تاکہ یہ ہر فرد کو باآسانی میسّر آ سکے۔ مگر اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی اس بنیادی ضرورت کے حصول کے لیے انسان کو بہت زیادہ روپیہ اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے اور بڑے صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد میزانِ عدل تک اس کی رسائی ہوتی ہے پھر اس میزان کا انتظام اتنا پُرپیچ ہوتا ہے کہ ایک عام انسان اس کے ابتدائی طریقِ کار کو بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور وہ جب تک کسی ماہرِ فن کی خدمات حاصل نہ کرے اس وقت تک وہ عدالت کی بارگاہ میں حاضری کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہی پیچیدگیاں انتظامیہ میں بھی ہر مرحلے پر پیش آتی ہیں۔ انتظامیہ کی اصل غرض تو اسی قدر ہے کہ وہ کسی معاشرے کے اندر رہنے والے افراد کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے تاکہ لوگ اطمینان اور سکون سے

زندگی بسر کرسکیں مگر مادی نظام نے اس کے طریقِ کار کو اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ کسی فرد کو اپنے اس انسانی بنیادی حق کے حاصل کرنے کے لیے اتنی کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ اسے زندگی کے دُوسرے مسائل یکسر بھُول جاتے ہیں۔

اندر کے انسان سے یہ اغماض اور صرف نظر اور خارجی زندگی اور اس کے معاملات سے یہ غیر معمولی وابستگی بلکہ انہماک اس اندازِ فکر کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جسے مادی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسان جب عالمِ باطن سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے تو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی راہ پر لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے خارجی دُنیا کے جھمیلوں میں پھنسا دیا جائے تاکہ وہ مصروف رہے۔

•••• یہ تو خیر داخلی زندگی کا مسئلہ ہے۔ خود انسان کی خارجی زندگی میں بے شمار مسائل ایسے ہیں جو سائنس دانوں کی توجہ کے محتاج ہیں۔ دُنیا میں ابھی کرہ ارض کا اچھا خاصا حصّہ ایسا ہے جو بے آب و گیاہ ہونے کی وجہ سے بیکار پڑا ہے۔ متعدد ایسی بیماریاں ہیں جن کا ابھی تک علاج دریافت نہیں ہُوا، اور انسانوں کی اچھی خاصی تعداد ان کا لُقمہ اجل بن رہی ہے مگر ان کے تدارک کے لیے اُس جوش اور انہماک اور اُس ایثار کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا جو جوہری بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اگر ان سائنسی تحقیقات کا مقصد فلاحِ انسانیت ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انسان سب سے زیادہ توجہ ان امور کی طرف دیتا جن سے انسانیت کو حقیقی بہبود حاصل ہوتی اس ضمن میں انسان سب سے پہلے اصلاحِ باطن کی طرف متوجہ ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں یہ فرمایا ہے کہ "تمھارے پہلو میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہے تو تمھارا پُورا جسم صحیح ہے اور اگر اس میں فساد ہے تو پھر سارا جسم فساد کی لپیٹ میں ہے۔" جب تک اخلاقی اور رُوحانی احساس کے اس سرچشمے کو حرص و آز، خود غرضی اور زبردست آزادی سے پاک نہیں

کیا جاتا اس وقت تک سائنسی تحقیقات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ اگر انسان واقعی انسانیت سے محبّت و ہمدردی رکھتا ہے اور وہ سچے دل سے اس کی فلاح کا طالب ہے تو اسے سب سے زیادہ توجّہ تہذیب نفس کے اس بنیادی کام پر دینی چاہیے مگر افسوس کہ اس کام سے وہ سب سے زیادہ غفلت برت رہا ہے۔ انسان کی بدنصیبی دیکھیے کہ وہ عام طبیعات میں اپنی ہنرمندی اور جُراَت دکھانے کے لیے تو ہر قسم کے ایثار کے لیے آمادہ ہوتا ہے مگر اپنے نفس پر کوئی معمولی سی پابندی عائد کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ کیونکہ یہ کام اگرچہ زندگی میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے مگر چاند پر اترنے سے جو سنسنی پیدا ہو سکتی ہے وہ تہذیب نفس سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے یہ کام اس کی توجہ کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

اس وقت انسانیت کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ کسی طرح انسان کو اس بات کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ عالم طبیعات سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو۔ یہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے بارے میں جو غلط نظریات پھیلے ہوئے ہیں ان کا ابطال کیا جاتے اور یہ بتایا جائے کہ وہ نہ تو حیوان ہے اور نہ معاشرے کی مشین کا بے بس پُرزہ، بلکہ ایک صاحبِ ارادہ اور اخلاقی اور رُوحانی احساس رکھنے والی ایک قابلِ احترام ہستی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ حیوانوں اور مشینوں کا سا سلوک کرنا سخت ناانصافی ہے ... جب تک نوعِ بشری اس کے جذبات و احساسات کو نظرانداز کر کے اُس کے ساتھ یہ ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر مُصر رہے گی اس وقت تک انسان کے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۹ء)

.... مغربی تہذیب نے انسانی معاشرے کے فطری توازن کو جس بیدردی کے ساتھ درہم برہم کیا ہے اس کے تلخ نتائج اب ساری قہرمانیوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آرہے ہیں اور ان کی تلخی کا احساس ان لوگوں کو بھی ہو رہا ہے

جو اس مادی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اس تہذیب نے فرد کی آزادی اور جمہوریت کے نام پر انسانوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت دی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو معیشت میں محنت کشوں کا استحصال شروع ہوا اور پھر جب حالات نے خوفناک صورت اختیار کر لی تو مزدوروں کی حکمرانی کے نام پر انسانوں کو اشتراکیت کی جکڑ بندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ اسی طرح سیاست میں زیردست آزادی بالادستوں کا شیوہ بن گئی۔ معاشرت میں بھی عائلی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں اور رشتۂ مناکحت کے احترام کے بجائے آزاد شہوت رانی لوگوں کا دلپسند مشغلہ بن گیا۔ گو مغربی تہذیب کے بطن سے نمودار ہونے والی یہ برائیاں آغاز میں اس قدر بھیانک دکھائی نہ دیتی تھیں جتنی کہ اب نظر آرہی ہیں مگر اصحابِ بصیرت کو شروع ہی میں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ یہ تہذیب جن غیر متوازن عناصر سے عبارت ہے وہ لازمی طور پر اس کی بربادی کا سامان بھی فراہم کریں گے اور مادیت کی جس شاخِ نازک پر اس نے اپنا آشیانہ بنا رکھا ہے وہ ٹوٹ کر اس آشیانے کو اس انداز سے پیوندِ خاک کرے گا کہ آنے والی نسلیں اس کی المناک تباہی پر خون کے آنسو بہائیں گی۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، اگست ۱۹۷۵ء)

سرمایہ داری، اشتراکیت اور بقائے باہمی

سرمایہ داری اور اشتراکیت نے انسان کی انسانیت کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ ان دو جدید نظاموں نے انسان کے اندر اتنا فہم اور احساس ہی نہیں رہنے دیا کہ وہ پیٹ اور جیب سے بلند ہو کر کسی دوسرے مسئلے پر غور کر سکے۔ آج کے انسان کو اگر کبھی شکایت ہو گی تو بھوک کی شکایت ہو گی اور اگر وہ کبھی گلہ کرے گا تو اس بات کا کرے گا کہ اس سے کام بہت لیا جاتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں اسے اجرت کم دی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا

آرزومند نظر آئے گا کہ اسے بھی عیاشیوں کے لیے سرمایہ داروں کی طرح مواقع فراہم ہوں۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ان نظاموں نے اس کی متاعِ اخلاق چھین لی ہے اور اسے محض ایک حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ اُس کو پاکیزہ اور لطیف احساسات وجذبات سے محروم کر دیا ہے اور اس کے خاندانی نظام کو درہم برہم کر کے گھریلو سکون اور آرام سے اسے تہی دست بنا دیا ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت دو متضاد نظام نہیں بلکہ ایک ہی رُخ کے دو پرتو ہیں۔ مرحوم سرمایہ داری اور اشتراکیت کے عملی تعاون کے بارے میں یُوں رقمطراز ہیں:

• • • • بعض لوگ سرمایہ داری اور اشتراکیت کو ایک دُوسرے کی ضد سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ اشتراکیت درحقیقت سرمایہ داری کی ارتقائی منزل ہے۔ جب زندگی کا مطلوب ومقصود دنیوی مفادات ہوں تو پھر اس راہ میں کسی ایسے اعتقاد، نظریہ یا عمل کو کیوں حائل ہونے دیا جائے جس سے اصل مقصد کا حصول دُشوار ہو۔ چنانچہ دیکھیے اس تضاد کو دُور کرنے کی وجہ سے اشتراکی ممالک چند سالوں میں مادی اعتبار سے اس مقام پر جا پہنچے ہیں جہاں تک پہنچنے میں سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ملکوں کو ایک طویل مدّت تک جدّوجہد کرنی پڑی . . . اشتراکیت کے ہاں اب معاملہ بالکل صاف ہے۔ اس کی حیثیت معاشرے کے لیے اینٹ اور روڑے کی سی ہے۔ معاشرے کے پیشِ نظر اجتماعی مفادات ہیں۔ معاشرہ ان مقاصد کے لیے افراد کو جس طرح چاہے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور جو فرد اس کی کسی خواہش کی تکمیل میں حائل ہو وہ سماج دشمن ہے۔ اس لیے معاشرہ جو بھی سخت سے سخت سزا اُسے دے وہ حق بجانب ہے۔ فرد کی روحانی اور اخلاقی نشوونما کے بجائے اب اسے اسی طرح تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ اجتماعی مفادات کے حصول کا مؤثر ذریعہ بن سکے۔

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت صرف ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دینے کا نام ہے۔ حالانکہ یہ اشتراکیت کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانا تو اس بنیادی اور اساسی اصول کی محض ظاہری علامت ہے جس کے تحت معاشرے کو خدا اور انسان کو اس کا بندہ بنا دیا گیا ہے۔ جس طرح انسان رکوع وسجود کر کے باری تعالیٰ کی بڑائی اور اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے بالکل اسی طرح افراد کو حقوقِ ملکیت سے محروم کر کے انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا زندگی کے کسی معاملے میں بھی کوئی مستقل حق نہیں ہے۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو سب اجتماعی مفادات کے تابع ہیں۔ ان کی ساری وابستگیاں صرف معاشرے کے لیے ہونی چاہئیں۔ معاشرہ انھیں اگر زندہ رہنے کا حق دے تو انھیں زندہ رہنا چاہیے اور اگر وہ انھیں اس سے محروم کرے تو انھیں خود بخود بڑی خوشی سے اس سے دستبردار ہونا چاہیے۔ جس طرح ایک بندۂ مومن خدائی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اسی طرح انھیں معاشرے کی زمامِ کار سنبھالنے والوں کی دل وجان سے اطاعت کرنی چاہیے اور ان کے ہر حکم اور فیصلہ کو اسی جذبۂ اخلاص سے قبول کرنا چاہیے جس طرح خدا کے فیصلوں کو قبول کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انھیں اس کے خلاف کچھ سوچنے کا حق بھی حاصل نہ ہونا چاہیے۔ اشتراکیت میں معاشرے سے ماورا کوئی بھی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں۔ اس کے مفادات سے زیادہ کوئی مفاد عزیز نہیں، اس کے حقوق پر کسی دُوسرے کا حق فائق نہیں۔ حقِ ملکیت سے محرومی تو محض انسان کی معاشرے کے سامنے عجز ونیاز اور عبودیت کا عملی اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی معاشرے اپنے اس حق کا مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے تقاضا کرتے ہیں۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت اصل کے اعتبار سے ایک دُوسرے کے کتنے قریب ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ دیکھیے کہ ان دونوں نے جن تہذیبوں کو جنم دیا ہے ان میں کس قدر یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ

تہذیب اور اشتراکی تہذیب میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مذہب سے بیزاری، پیدائش دولت کے لیے اندھا جنون، کمزوروں کے حقوق پر ڈاکے، بین الاقوامی تعلقات میں بے اصولی اور مادی مفادات کی خاطر ہر دُوسرے مفاد کی قربانی دونوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ گزشتہ پندرہ بیس سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ پرست امریکہ اور برطانیہ اور اشتراکیت کے علمبردار روس کے طرزِ عمل میں کوئی معمولی سا فرق ہے۔ مفادات کا جنون ان سب کو ایک سا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ امریکہ جب اپنے مادی مفادات پر کوئی آنچ آتے دیکھتا ہے تو کوریا اور ویت نام میں انسانی خون سے ہولی کھیلنے لگتا ہے اور لاکھوں معصوم انسانوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے اور روس پر جب یہ جنون سوار ہوتا ہے تو وہ ہنگری اور چیکوسلاویکیہ پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ دستِ ظلم دراز کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی اخلاقی ضابطے کا پابند دکھائی نہیں دیتا۔ انسان اپنے فعل سے، درخت اپنے ثمر سے اور نظام حیات اس اجتماعی اخلاق سے پہچانا جاتا ہے۔ جس کا مظاہرہ وہ زندگی کے مختلف معاملات میں کرتا ہے۔ جس طرح ایک خود غرض فرد ناقابلِ اعتماد ہے، بالکل اسی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت کے اجتماعی اخلاق پر کسی طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے علمبردار ممالک کے درمیان بقائے باہم کا جو اصول طے کیا گیا ہے یہ کسی انسانیت دوستی کا نتیجہ نہیں بلکہ چوروں کے مابین اس اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ ہے س کے تحت وہ یہ طے کرتے ہیں کہ تم ایک خاص حدود میں رہنے والے لوگوں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناؤ اور ہم تم سے تعرّض نہیں کریں گے اور ہم دُوسری حدود میں جب لُوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کریں تو تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو گے۔ مفادات کی پرستش نے ان دونوں نظاموں کے علمبرداروں کو ایک دُوسرے کا ہم عنان بنا دیا ہے اور وہ ایک دُوسرے کے ساتھ مل کر انسانیت کو برباد کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کے درمیان تعاون

کی راہیں اب اس قدر کشادہ ہوگئی ہیں کہ مشرقی ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک میں تو ان کا طرزِ عمل بالکل ایک جیسا ہے۔ اشتراکیت اس بات سے خوش ہے کہ یہاں لوگوں کے اندر سرمایہ پرستی کا جنون پیدا ہو رہا ہے اور یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ان کے دلوں سے خدا اور اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ختم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ دُنیا پرستی لے رہی ہے۔ یہ تبدیلی اشتراکیت کے لیے نہایت خوش آئند ہے۔ دولت کی محبت سے معاشرے میں ذہنی اور اخلاقی خلفشار پیدا ہوتا ہے جسے دُور کرنے کے لیے ریاست کا عمل دخل ناگزیر طور پر بڑھ جاتا ہے اور یہ سب چیزیں اشتراکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ جب یہاں اشتراکیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے تو سرمایہ دار ممالک کو بے حد خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کسی دینی معاشرے کی بنیاد منہدم ہو رہی ہے۔

(ایمان اور اخلاق)

مغربی نظامِ تعلیم اور اس کے اثرات

مغربی نظامِ تعلیم نے مسلم قوم کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس نظامِ تعلیم نے مسلمان قوم کے نوجوانوں کو یہ درس دیا ہے کہ تعلیم کا مقصد سوائے روٹی کمانے کے اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ اس نظامِ تعلیم نے جہاں مسلمان قوم کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے وہاں اس قوم کو ایمان کی قوت سے بھی محروم کر دیا ہے اور نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ قوم جو کبھی عظمت کا نشان تھی آج ذلت کی انتہاہ گہرائیوں میں گری ہُوئی ہے۔ مرحوم بذاتِ خود ایک مانے ہُوئے ماہر تعلیم تھے اور مغربی نظامِ تعلیم سے ان کا تعلق ایک طویل عرصہ تک رہا اس لیے وہ اس کے مُہلک اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ مرحوم فرماتے ہیں:

••• دُنیا کا ہر نظامِ تعلیم کسی خاص کلچر یا تہذیب کو پروان چڑھانے کے

لیے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اس لیے ہر زندہ قوم اپنے نظامِ تعلیم کو اس طریق سے مرتب کرتی ہے کہ اُس سے اُس کے نوجوانوں کی علمی و فکری ترقی ہو سکے، اور جب بڑے ہو کر وہ جولانگاہِ حیات میں عملاً شریک ہوں تو اس بُنیادی اور اساسی تخیل کی خدمت کریں جس پر ان کے قومی تشخص کا دارومدار ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے نظامِ تعلیم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے اور یہ تبدیلی بالکل تھوڑے عرصے میں پوری کی پوری قوم کو بانجھ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر دُنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے اور جس کے نتائج آج خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ قوم جس کی حرارتِ ایمانی سے کبھی پُوری انسانیت سرگرمِ عمل تھی آج راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، وہ جس کے سوزِ یقین نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسُو سنوارے، تمدّن کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا وہ خود آج بے رُوح انسانوں کی بھیڑ نظر آتی ہے۔ یہ سب اس نئے نظامِ تعلیم کی کرشمہ سازی ہے۔

•••• بدقسمتی سے ہم کو انگریزی نظامِ تعلیم نے مغربی علوم سے صرف حقائق ہی نہیں دیے بلکہ وہ بنیادی نقطہ نظر بھی دے دیا ہے جس کے تحت وہ مُرتب کیے گئے تھے۔ اب دیکھ لیجیے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم نے ان مغربی علوم و فنون کے حاصل کرنے میں جو قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں ان سے ہم کو بحیثیتِ مجموعی کیا فائدہ پہنچا ہے۔ پوری قوم ان علوم کو پڑھنے کے بعد ایک شدید قسم کے ذہنی انتشار میں مُبتلا ہو گئی ہے۔ ہمارے نوجوان ایک طرف تو ان تصوّرات کو بالکلیہ ترک کر دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو انھیں ماضی سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں اور دوسری طرف ہمارے مدارس اور کالجوں سے وہ ایسے افکار سے متاثر ہوتے رہتے ہیں جو ان تصورات کی بالکل ضد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ علوم و فنون انھیں کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کے بجائے انھیں ایک سخت قسم

کی ذہنی کشمکش میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی چیز موجودہ نظامِ تعلیم میں سب سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ ہم اپنے ہاں جو ایک ذہنی خلفشار اور افلاس دیکھتے ہیں وہ اسی مغربی نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری قوم کو فکری طور پر بالکل مُفلس بنا کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ میرا تعلق برسوں سے اس نظامِ تعلیم کے ساتھ چلا آرہا ہے اس لیے میں اس کے مہلک اثرات سے بھی پُوری طرح واقف ہوں۔ میں نے طلبا کے مختلف طبقات میں گھُوم پھر کر اس کے نتائج سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک جتنے طلباء سے میرا سابقہ پڑا ہے انھیں مندرجہ ذیل تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ایک بہت بڑی تعداد ان طلبا کی دیکھنے میں آئی ہے جو اس زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق سنجیدہ غور و فکر کے قطعاً عادی نہیں رہے۔ اُن کی حیثیت بالکل جانوروں کی سی ہے جن کے سامنے بجز "چارے" کے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ لوگ سوچ بچار کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اس لیے ان کے ذہن ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہتے ہیں۔ مغربی نظامِ تعلیم نے اس طبقے کو پوری طرح بیکار بنا دیا ہے اور ان سے سوائے اپنے پیٹ کے کسی دوسری خدمت کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔

دُوسرا طبقہ ایسا ہے جو مغربی علوم و فنون پڑھتا تو ہے لیکن ان کے بارے میں سوچتا بہت کم ہے مگر جونہی ان علوم کے اثرات اس کے ذہن پر مرتب ہونے شروع ہوتے ہیں تو وہ خواہ اس کا زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے، اس کا یقین بہر حال متزلزل ہوتا جاتا ہے اور وہ زندگی کے معاملات سے بالکل "شریفانہ" طور پر بے تعلق ہو جانے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جسے اسلام کے بنیادی نظریات و تصوّرات سے گہری عقیدت و وابستگی ہوتی ہے۔ وہ مغربی افکار کو باطل سمجھتا تو ہے مگر اس کے معاملہ میں مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ نہ تو وہ انھیں باطل ثابت کر سکتا ہے اور نہ اسلام

کے متعلق کوئی مثبت علم رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم سے بہت حد تک مرعوب ہو جاتا ہے اور اسلام کے اساسی تصوّرات کو ان کے مطابق ڈھال کر اُس تضاد کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے اپنے دل پسند نظریات اور مغربی افکار کے درمیان پایا جاتا ہے مگر جب کسی نقطہ پر ان دونوں کے درمیان تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اسلامی تصوّرات کو "مُلّا" کی اختراع کہہ کر بڑی بے باکی سے ردّ کر دیتا ہے۔ میں نے دین کے لیے قابلِ رشک حمیت رکھنے والے طلبا میں بھی اس ذہنی انتشار کی جھلکیاں دیکھی ہیں اور محسوس کیا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود اُس سوزِ یقین سے خالی ہیں جو ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے بغیر عمل کی تڑپ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان بیچاروں کی ساری قوتیں اس ذہنی کشمکش کی نذر ہو جاتی ہیں اور وہ دینِ حق کے لیے بڑی مقدس آرزوئیں اور تمنائیں رکھنے کے باوجود اس کی کوئی خدمت نہیں کر پاتے۔

•••• باقی رہی وہ نہایت قلیل سی تعداد جس کی طبیعت اس قسم کی توجیہات پر مائل نہیں ہوتی۔ اس کا حال بھی اس طبقہ سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ایمان کی عافیت اسی میں سمجھتی ہے کہ دُنیا اور اس کے مسائل سے بالکل آنکھیں بند کر لے اور زندگی کے دن اس طریق سے گزارے گویا کہ یہاں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں جو اس کی توجہ کا محتاج ہو۔ اس طبقہ کی آخری پناہ گاہ تصوّف ہے اور متصوفانہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں ہی ایک مدت گُم رہ کر اس طبقہ کے لوگ اپنے خالق اور مالک سے جا ملتے ہیں۔ اس کارگہِ حیات میں یہ حضرات کبھی شریک نہیں ہوتے اور یہاں بالکل غیر متعلق تماشائیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں وہ اپنی ذات میں خواہ کتنے نیک اور پاک باز ہوں مگر انسانیت ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ جبر و استبداد یہاں کھلے بندوں پھرتا ہے مگر انھیں اس کے روکنے کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

یہ ہیں وہ عملی نتائج جو مغرب کے صرف ایک نظریہ کو قبول کر لینے سے ایک مسلمان نوجوان کے ذہن پر مرتب ہوتے ہیں اور جب پُوری قوم کو اسی قسم کے باطل نظریات پر پالا جائے تو اس قوم کی حالتِ زار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مغربی نظامِ تعلیم نے ہمارے ذہنوں کے اندر جو انتشار اور خلفشار پیدا کر رکھا ہے اس نے ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور یہی دراصل وہ عظیم نقصان ہے جو ہمیں اس نظامِ تعلیم سے پہنچا ہے۔

اب اگر ہم اصلاحِ احوال کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صُورت یہ نہیں کہ ہم چند مضامین میں تغیر و تبدّل کر دیں یا مغربی علوم و فنون کے ساتھ اسلامیات کے اجزا بڑھا دیں بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مغرب نے جن حقائق کو اپنے باطل نظریات کے مطابق مرتب کیا ہے انھیں ہم اُس کے نظامِ فکر سے الگ کر کے اسلامی نقطہ نظر کے مطابق پھر سے مرتّب کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ آخر ہمارے اسلاف نے بھی تو کائنات کے انہی مظاہر اور حوادث کو ترتیب دے کر اپنے علوم و فنون اس طرح مدوّن کیے تھے کہ وہ اسلام کی بنیادی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ انہی حقائق کے مطالعہ سے اُن کے اندر وہ عزم اور یقین پیدا ہوا تھا جسے دیکھ کر پہاڑ بھی ندامت سے جُھک جاتے۔ جب تک ہم یہ کام نہیں کرتے مسلمانوں کے اندر ایمان کی حرارت اور عمل کی تڑپ کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۵۹ء)

مذہب اور سیاست

خالقِ حقیقی کا ادراک چونکہ ایک رُوحانی کیفیت کا نام ہے اس لیے ایک گروہ نے یہ سمجھا کہ مذہبی زندگی گزارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ محسوس اور مادّی چیزوں سے یکسر دامن بچا کر صرف مراقبہ اور گیان دھیان کے ذریعہ

مشاہدۂ حق کیا جائے۔ ان لوگوں کے نزدیک مذہب کا تعلق انسان کے لطیف جذبات واحساسات سے ہے اور جو چیزیں یا داعیات ان میں حائل ہوتے ہیں وہ مادی آلائشیں ہیں جن سے ایک مذہبی آدمی کو اپنا دامن بچانا چاہیے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نیک اور خدا پرست لوگ تو دیدارِ الٰہی میں منہمک ہو گئے اور دنیا کے سارے معاملات حرص وہوا کے بندوں کے ہاتھ میں منتقل ہونے لگے اور انھوں نے انسانیت کو اپنی ہوس کاریوں اور ستمرانیوں کا تختۂ مشق بنانا شروع کیا۔ جب بگڑے ہُوئے لوگ قوت وطاقت کے مالک بن جائیں اور معاشرے کے خداترس اور با اخلاق افراد امورِ دنیا سے یکسر بے تعلق ہو جائیں تو پھر ظلم واستبداد کی راہ کون روک سکتا ہے۔ انسان کے اس طرزِ عمل سے بدقماش لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ مذہب اور سیاست کی علیٰحدگی کے اس غلط تصور کے بارے میں مرحوم لکھتے ہیں:

.... مغرب کی تہذیبی یلغار اور اس کے سیاسی تسلّط کے بعد دنیائے اسلام میں جو خوفناک بگاڑ پیدا ہُوا ہے اس کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس بگاڑ کو فاسد خیالات کے چار فتنوں نے جنم دیا ہے جن میں سے سب سے اہم مذہب اور سیاست کی علیٰحدگی کا مذموم تصوّر ہے جسے عوام کے ذہنوں میں بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کے ساتھ بٹھایا گیا ہے۔ اُنہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہب ایک مقدس اور پاکیزہ چیز ہے اور سیاست شیطان کا کھیل ہے لہٰذا پاکیزگی کا تصوّر شیطنیت کو اس سے دُور رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے جو فرد یا گروہ ان دونوں کو ایک دُوسرے کے قریب لاتا ہے وہ مذہب جیسی مقدس شے کی شیطان کے ہاتھوں تذلیل کرواتا ہے۔ لہٰذا اس آسمان کے نیچے اُس سے بڑا ظالم اور سفاک اور نیکی اور بھلائی کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے جو ایک پاک اور مقدس شے کو شیطان کی تحویل میں دینے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مذہب کے ساتھ سچّی

محبّت رکھتا ہے اور خدا کی رضا کا اخلاص کے ساتھ طالب ہے اور آخرت میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ سرخروئی کا خواہاں ہے تو اس کا فرض ہے کہ خود کو اور مذہب کو سیاست کی پرچھائیں سے پوری قوت کے ساتھ بچائے۔ اہلِ مغرب کا یہ جادو اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنا ہمہ گیر اور مؤثر ثابت ہوا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے ایک نہایت ہی محدود سے طبقے کو چھوڑ کر اہلِ علم اور اربابِ تصوّف کی ایک کثیر تعداد نے مذہب اور سیاست کی دوئی کے فلسفے کو پوری طرح اپنا لیا اور سیاسی معاملات سے اس طرح تنفّر اور دُوری اختیار کی جس طرح کسی صریح حرام چیز سے اختیار کی جاتی ہے۔

•••• مذہب اور سیاست کی جُدائی کا فلسفہ یوں تو ہر مذہب کے لیے سمِ قاتل ہے لیکن خاص طور پر اسلام جیسے انقلاب انگیز اور ہمہ گیر دین کے لیے یہ بربادی اور موت کا پیغام ہے۔ بعض سادہ لوح مسلمان اس فلسفے کے عواقب سے ناواقف ہونے کی بنا پر اس کے طلسم میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں تو اس کی غیر معقولیّت جلد ہی کھل کر ان کے سامنے آجائے گی۔ آپ اس حقیقت کو جاننے کے لیے سب سے پہلے کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں ہیئتِ حاکمہ کے مقام کا تعین کریں۔ علمِ سیاست کی فنّی پیچیدگیوں سے ہٹ کر اگر اس اہم شعبۂ حیات پر غور کیا جائے تو اس حقیقت کا جاننا کچھ مشکل نہیں کہ نظامِ حکومت پر مکمل اختیار ہونے کی وجہ سے حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کی تنظیم اور ان کے مابین معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کرنے کا کام صرف شعبۂ سیاست ہی کرتا ہے۔ اس شعبہ کی حیثیت اس ناظم کی سی ہے جو نہ صرف اپنے ماتحتوں پر بڑے وسیع اختیارات رکھتا ہے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمّہ داری بھی براہِ راست اسی پر عائد ہوتی ہے۔ وہ ان کے افکار و نظریات کو جس سانچے میں چاہے ڈھالے، جن عادات کو ان کے اندر راسخ کرنا چاہے راسخ کرے اور پھر ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جن مقاصد کے حصول کی خاطر چاہے استعمال کرے کوئی اس کی راہ

نہیں روک سکتا۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ انسان ناظمین کے ہاتھوں میں اس طرح بے بس نہیں ہوتے جس طرح کہ ظروف سازوں کے ہاتھ میں گندھی ہوئی مٹی کا گوندا۔ انسانوں کے فطری داعیات کے اختلاف کی وجہ سے اُن کے طرزِ عمل ایک دُوسرے سے الگ اور جُدا ہوتے ہیں لیکن جس چیز کو لوگ اجتماعی ماحول کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ اُسی نہج پر تیار ہوتا ہے جس پر کہ یہ ناظمین اسے تیار کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔

•••• کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں ہیئتِ حاکمہ بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی گاڑی کے لیے اس کے انجن کی ہوتی ہے۔ گاڑی کے مختلف ڈبوں کو کسی قوم کے معاشرتی اور معاشی ڈھانچوں سے تعبیر کر لیجیے اور ان میں بیٹھے ہوئے مُسافروں کو معاشرے کے افراد پر قیاس کیجیے تو آپ کو حیاتِ اجتماعی کے سیاسی انجن کے سامنے ان کی بے بسی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ جن ڈبوں کو اس انجن کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو اور جو مسافر ان ڈبوں میں بیٹھ گئے ہوں وہ اس بات کے لیے بالکل مجبور ہوتے ہیں کہ اُسی سمت آگے بڑھیں جس سمت کہ انجن انھیں کھینچے لیے جا رہا ہے۔ بعض لوگ اگر اس سمت کو غلط سمجھ رہے ہوں اور انھیں اس امر کا احساس ہو کہ اُن کی منزلِ مقصود دوسری سمت میں ہے تو ان کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہ انجن کو روکنے کی کوشش کریں اور پھر اُسے اُس سمت بڑھانے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں جس سمت وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ انجن کو روکے بغیر اور اُسے صحیح سمت پر ڈالے بغیر غلط سمت کا واویلا کرنا، دل کی بھڑاس نکالنے کے علاوہ ایک مقدس آرزو کا اظہار تو ضرور ہے لیکن میدانِ عمل میں اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

•••• مغربی سامراج کے سامنے جتنی مُسلم سلطنتیں بھی سرنگوں ہوئیں ان سب میں مسلمانوں کو یہی مژدہ جانفزا سنایا جاتا رہا کہ ہم تو صرف نظامِ حکومت کو بہتر بنانے کے لیے اِس ملک پر قابض ہوئے ہیں۔ دین کے معاملے میں بندگانِ خدا

بالکل آزاد ہیں بلکہ اس باب میں تو ہم ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے بھی تیار ہیں بشرطیکہ وہ اقتدار کی طمع دل سے نکال دیں اور اس پر ہمارے قبضہ کو خوشدلی سے قبول کر لیں مسلمانوں نے اس اعلان کو غنیمت سمجھا لیکن چند سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ دین کی آزادی اور اس کے تحفظ کے قول و قرار کے باوجود اُن کے عقائد بگڑنے لگے، ان کے افکار و نظریات میں انتشار پیدا ہونا شروع ہوا، ان کے اخلاق پر تباہی کے مہیب سائے چھانے لگے، ان کی معیشت میں حلال اجزا گھٹنے لگے اور حرام کا عنصر بڑھنے لگا اور ان کی معاشرت سے وہ تمام خوبیاں رخصت ہونے لگیں جن کی وجہ سے اس کی پاکیزگی قائم تھی اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے منشا کے علی الرغم ہوا۔ وہ اس صورتِ حال پر کبھی خوش نہ تھے بلکہ خون کے آنسو بہاتے تھے مگر جو لوگ اقتدار پر قابض تھے۔ انھوں نے اس غیر معمولی قوت اور وسیع اختیارات سے فائدہ اُٹھا کر ایک مسلمان کے لیے بحیثیت مسلمان زندہ رہنا بالکل ناممکن بنا دیا۔ اللہ رب العزت کا مخلص بندہ اپنی اولاد کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات پر عمل پیرا دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنے جگر پاروں کو خدا اور اُس کے رسولؐ کے باغیوں کی صف میں پایا، وہ معاشی میدان میں اکلِ حلال کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے لقمۂ حرام کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہ آئی، وہ زندگی کے ہر شعبے میں حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہونے کا متمنی تھا لیکن غیر اسلامی نظام کے تسلّط کی وجہ سے وہ قدم قدم پر حق و صداقت کا خون کرنے پر مجبور ہوا اور تضاد کی اس ہولناک فضا نے نہ صرف اس کی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو برباد کر کے رکھ دیا بلکہ اس کے سینے میں دینی آرزوؤں کے جو چراغ روشن تھے انھیں بھی گُل کر دیا۔

.... اُمتِ مسلمہ کے بعض سادہ لوح بھی خواہ بڑے جوش اور جذبۂ اخلاص سے کہتے ہیں کہ آؤ سیاست کو چھوڑ کر پہلے اصلاحِ معاشرہ کے لیے

کام کریں اور اگر معاشرہ کی اصلاح کا پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر حکومت خود بخود درست ہو جائے گی۔ ان نیک نفس اور پاکباز حضرات کا خلوص اپنی جگہ مسلّم مگر انھوں نے حکومت کی اصلاح کے لیے معاشرے کی اصلاح کی جو شرط لگائی ہے وہ ایسی شرط ہے جسے حکایتِ تشنہ و سراب ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان مصلحین کی یہ نیک توقعات دو غلط مفروضات پر قائم ہیں۔ ایک یہ کہ معاشرہ کوئی ایسا الگ تھلگ جزیرہ ہے جسے سیاست کی لہروں سے یکسر محفوظ رکھ کر اس کے اندر اپنی مرضی کے مطابق اصلاح کا کام بلا روک ٹوک انجام دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے اربابِ اقتدار کو ان مقدس ہستیوں کے ساتھ اس حد تک تعاون کرنے پر آمادہ کرنا ممکن ہے کہ یہ حضرات جب تک اصلاحِ معاشرہ کے کام سے فارغ نہ ہو جائیں کم از کم اس وقت تک حکومت کی مشینری اور اس کے وسائل سے معاشرے کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کا کام معطل رکھا جائے گا۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ کیا میدانِ عمل میں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ممکن ہے۔ جس نظم کو آپ معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ جس نظمِ اجتماعی کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو آپ خاندان کا نام دیتے ہیں وہ نہ صرف ہر آن سیاسی قوتوں کی زد میں ہوتا ہے بلکہ سیاسی قوتیں اُن کی صورت گری کرتی ہیں۔ جو چیز اپنے وجود ——— کے لیے کسی بالاتر قوت کی رہینِ منّت ہو اس کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ اسے اس کے مؤثر اثرات سے بچایا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی سادگی ہے جو راہبوں کو تو زیب دیتی ہو لیکن ان مومنین کو زیب نہیں دیتی جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں۔

مغربی نظریۂ قومیت اور ملّتِ مُسلمہ پر اس کے اثرات

مسلمان قوم کی شیرازہ بندی خاک و خون کے رشتوں سے نہیں ہوتی بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ مسلمان خواہ کسی مُلک، قبیلے، رنگ اور نسل سے

تعلق رکھتا ہو وہ اپنے آپ کو بین الاقوامی مسلم برادری کا ایک رُکن سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ وطنی اور نسلی مفادات سے بلند تر ہو کر سوچتا ہے۔ گزشتہ دو تین سو سال میں کون سی ایسی افتاد ہے جس کا سامنا مسلمانوں کو نہیں کرنا پڑا۔ اقوامِ مغرب نے انھیں غلام بنایا، ان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹا اور ان پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے مگر ان ساری مصیبتوں کو مسلمانوں نے یک جان ہو کر برداشت کیا۔ اسلام دشمن قوتیں عرصہ دراز سے کوئی ایسی تدبیر تلاش کرنے میں کوشاں ہیں جس سے مسلمانوں کی اس بین الاقوامی برادری کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے مگر ان میں سے سب سے زیادہ مؤثر ہتھکنڈہ مغربی قومیت کے تصوّر کا پرچار تھا جس نے ملّتِ مسلمہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مسلمان ممالک جو ایک دُوسرے کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتے تھے اسی مغربی قومیت کے تصوّر کی بنا پر ایک دُوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ مرحوم اس سلسلے میں یُوں رقمطراز ہیں :

•••• مسلمان قوم کے لیے اس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اس کے اندر جارحانہ قوم پرستی کے جراثیم پھیلنے شروع ہُوئے۔ مغربی اقوام خصوصاً یہودی عرصہ دراز سے اس ٹوہ میں لگے ہُوئے تھے کہ وہ کون سی تدبیر ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کر سکے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے یُوں تو مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے رہے اور اب بھی کیے جا رہے ہیں مگر ان میں سے سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز تجویز یہی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر مغربی قومیت کے تصوّرات کو رواج دیا جائے کیونکہ اُن کے سرایت کر جانے کے بعد انھیں کوئی چیز تباہ ہونے سے بچا نہ سکے گی۔ پھر یہ کام نسبتاً آسان ہے اور اسے غیر محسوس طور پر بغیر خطرے کا کوئی الارم پیدا کیے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اس کا آغاز وطن کی محبت کے فطری جذبے سے کیا۔ پھر مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ وطن کے مفادات دُوسرے

سارے مفادات سے عزیز تر ہونے چاہئیں اور کسی دُوسرے ملک کے رہنے والے مسلمان اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ ان کی خاطر انھیں قربان کیا جا سکے۔ اسلام کا رشتہ مقدس سہی مگر اسے وطن کے رشتے پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں کے اندر وطن پرستی کے جذبات پیدا کیے گئے۔ مسلم قوم کے اندر اسلام نے جس احساس کی آبیاری کی تھی وہ یہ تھی کہ اس کے ہر فرد کو اوّل و آخر مسلمان ہونا چاہیے اور اللہ کے دین کی خاطر ہی اسے زندہ رہنا اور مرنا چاہیے۔ اس ایک مقصد کے مقابلے میں باقی سب مقاصد غلط اور بیکار ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ خدا کی محبّت کے ساتھ وطن کی محبت کا سلسلہ شروع ہُوا اور دینی مفادات کے پہلو بہ پہلو وطنی مفادات بھی اُبھرنے لگے مگر یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیونکہ دنیا کی ہر قوم کو قدم قدم پر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کے نزدیک زندگی کا اہم ترین مقصد کون سا ہے اور اس کی روشنی میں اس کی سب سے قیمتی متاع کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اُسے جدوجہد کا کون سا انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی وطن پرستی اور خدا پرستی، دینی تقاضوں اور وطن کے مفادات کے درمیان جلد فیصلہ کرنا پڑا کیونکہ یہ فیصلہ کیے بغیر ان کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے شروع میں تو اس ذہنی کش مکش کو ملّت اور قوم کے درمیان لفظی تفریق کر کے اُسے چھپانے کی کوشش کی مگر خدا کی پرستش اور وطن کی پرستش کو چونکہ بیک وقت نبھانا ناممکنات میں سے ہے۔ اس لیے انھوں نے جلد ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ پہلے وطن کے پرستار ہیں اور بعد میں خُدا تعالیٰ کے اطاعت شعار۔ مغرب نے قومیت کا جو نیا مذہب پیش کیا ہے اس میں یُوں تو سوائے "مذہب وطنیت" کے کسی دوسرے جاندار مذہب کے وجود کی گنجائش نہیں ہو سکتی مگر خاص طور پر اسلام کو تو وہاں کسی صُورت بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ وہ وطن کے بارے میں بھی ایک خاص زاویۂ نگاہ

رکھتا ہے جو اس فلسفے سے براہِ راست متصادم ہے جسکو مغربی قوم پرستی نے جنم دیا ہے اس لیے وہ قوم جو ایک ہی وقت میں اسلام اور مغربی قومیت کے نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ جلد از جلد انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ملکی اور قومی مفادات کو اوّلیت کا درجہ دیتی ہے تو اسے بہت سے دینی تقاضے پسِ پشت ڈالنے پڑتے ہیں اور اگر وہ دینی تقاضوں کو پُورا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بہت سے قومی مفادات نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوئی فرد بیک وقت دو مخالف سمت میں چلنے والی کشتیوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح ملتِ اسلامیہ اسلام اور مغربی قومیت کو ایک ہی وقت میں اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے دونوں میں بہرحال ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ دو تین ممالک کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مسلم ممالک نے وطن پرستی کا مسلک اختیار کیا اور اس کے تقاضوں کے تحت اپنی قومی زندگی کی تشکیل شروع کی۔ اسلام وہاں سے بالکل نیست و نابُود تو نہ ہو سکا مگر وہ کوئی انقلاب انگیز قوت کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ وہاں کے عوام نے اسے چند بے جان رسوم کا مجموعہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اس حیثیت میں آخر کوئی دین کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اللہ کا دین وطنیت کے ہر آن بڑھتے ہوُئے تقاضوں کے پیشِ نظر ہر میدان میں اپنی بساط لپیٹتا چلا گیا اور بالآخر مسلم ممالک میں بالکل مغلوب و مفلوج ہو کر رہ گیا۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۷۱ء)

مُسلمانوں کے زوال کے اسباب

کسی قوم کو عرُوج اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے افراد کسی نظریے کی صحت پر ایمان لا کر اور اس کے ساتھ سچی وابستگی پیدا کر کے اور عزمِ راسخ کے ساتھ اس کے غلبے کے لیے بھرپور جدّوجہد شروع کریں اور

اسے زوال اس وقت آتا ہے جب اس نظریے میں اُن کی دلبستگی ختم ہونے لگے اور دُنیوی مفادات کا حصول ان کا منتہائے مقصود بن جائے مرحوم مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

... اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ مسلمانوں کو کس روگ نے تباہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ محبت اور عقیدت کے دعوے کے باوجود اس سے بے رغبتی اور دنیاوی مفادات کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی رغبت اور دلچسپی۔ یہ ایک ایسا روگ ہے جس نے اس "اُمت" کو خدا اور خلق دونوں کی نظروں میں رسوا کیا ہے۔ خدا کی نظر میں تو ہم اس لیے ذلیل ہیں کہ زبان کی حد تک تو ہم اس بات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں کہ اے خالق تو ہی ہمارا اللہ اور معبود ہے۔ تیرا عطا کردہ دین ہی ہماری دنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کا ضامن ہے۔ تیرا رسول ؐ ہی ہدایت کا واحد سرچشمہ ہے اور اس کی محبت اور پیروی ہی سے ہم دُنیا اور آخرت میں فائز المرام ہو سکتے ہیں لیکن ان بدیہی حقائق کے اعتراف کے بعد جب ہم زندگی کے عملی میدان میں اُترتے ہیں تو ہم اپنے اعمال سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمیں خُدا کی رضا مطلوب نہیں بلکہ مادی مفادات عزیز ہیں۔ ہم اپنے خالق اور مالک کی نظرِ کرم کے محتاج نہیں بلکہ اقتدار کی نگاہِ التفات کے متمنّی ہیں۔ ہماری کامیابی اور کامرانی دینِ حق کی اطاعت سے وابستہ نہیں بلکہ ان افکار و نظریات کی رہینِ منّت ہے جو ہمارے اصحابِ اقتدار اور ان کے منظورِ نظر دانش وروں نے اہلِ مغرب سے مانگ تانگ کر ہمیں دیے ہیں۔ ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر ناز نہیں بلکہ مغربی مُلحدین کی دریوزہ گری پر فخر ہے۔ قول و فعل کا یہ خوفناک تضاد ہماری بربادی اور ذلّت و خواری کا واحد سبب ہے۔ خدا ہم سے اس لیے ناراض ہے کہ ہم اس کے ساتھ جو عہد و پیمان باندھتے ہیں اسے ہر قدم پر توڑتے ہیں اور خلق ہم سے اس لیے خفا ہے

کہ ہم اپنی زندگی کا کوئی اصول اور نظریہ نہیں رکھتے۔ ہم متضاد نعروں اور متضاد طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم کسی اصول کے علمبردار نہیں بلکہ بے ضمیر افراد کا ایک ٹولہ ہیں جسے اقتدار کے اشارہ ابروئے چشم پر رقص کرنے کے علاوہ کسی چیز کی تربیت حاصل نہیں۔ اس قسم کے طالع آزماؤں کے لیے کسی دل میں عزت و احترام کا کونسا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ دُنیا کی رِیت ہے کہ یہاں ایک بااصول کافر کی پذیرائی تو ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی اصول پرستی کی بنا پر اس پر کسی حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایک بے اصول اور بے ضمیر خدا پرستی کے اُس دعویدار کے لیے عزت کا کوئی مقام پیدا نہیں ہو سکتا جس کے اعمال اس کے دعوے کی تردید کرنے والے ہوں جو شخص خدا کے مقدس نام پر لوگوں کو دھوکہ دینے سے باز نہیں رہتا اُس پر خدا کی مخلوق کس طرح اعتماد کر سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دُنیا میں جس قدر رفعت اور سربلندی خدا پرست قوموں کو حاصل ہوئی ہے وہ ملحد اقوام کو حاصل نہیں ہوئی لیکن جب ان مذہبی قوموں نے خدا پرستی کے مسلک کو چھوڑ کر دنیا پرستی کو اپنا شعار بنایا تو جس قدر ذلت و خواری ان قوموں کے حصے میں آئی اس کی نظیر دوسری قوموں میں کم ہی ملتی ہے۔

(اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۷۵ء)

مندرجہ بالا عنوانات کا انتخاب کسی معنوی ربط کو مدّنظر رکھتے ہوئے نہیں کیا گیا بلکہ یہ دعوتِ دین پر مبنی چند ایک مختلف موضوعات ہیں جن پر مرحوم نے لکھا اور خُوب لکھا۔ اس مردِ حق آگاہ نے دَورِ جدید کے اُن باطل نظریات اور مُلحدانہ نظاموں کا بھی پردہ چاک کیا جس نے اُمتِ مسلمہ کے اخلاق اور اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی رُوحانی احساس سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ مرحوم مسلمانوں کے اس اخلاقی انحطاط پر بہت دل گرفتہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں کئی بصیرت افروز مضامین لکھے جن میں اس امر پر زور دیا گیا کہ انسان اپنے رُوحانی احساس کی

آبیاری صرف تعلیماتِ الٰہیہ سے ہی کر سکتا ہے۔

مرحُوم نے اپنی تحریروں اور تصانیف کے ذریعے دینِ اسلام اور مسلمانوں کی بے پناہ خدمت سرانجام دی ہے۔ اللہ مرحوم کو اجرِ جزیل عطا فرمائے اور ان کی تحریروں اور تصانیف کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔

رَحْمَةُ اللهِ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

(محمد اقبال صدیقی)

[illegible]

[illegible] ہو سکتی ہے [illegible] کسی حد تک مجبور کیا
جا سکتا ہے لیکن ایک بے اصول اور بے عمل خدا پرستی کے اس دعویدار کے لیے
(بقیہ بالا)
عزت کا کوئی مقام نہیں ہو سکتا جن کے اعمال اس کے دعوے کی تردید
کرنے والے ہوں جو شخص خدا کے مقدس نام پر لوگوں کو دھوکہ دینے سے باز
نہیں رہتا اس پر خدا کی مخلوق کس طرح اعتماد کر سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا
میں جس قدر رفعت اور سربلندی خدا پرست قوموں کو حاصل ہوئی ہے وہ غلط اقوام
کو حاصل نہیں ہوئی لیکن جب ان مذہبی قوموں نے خدا پرستی کے مسلک کو
چھوڑ کر دنیا پرستی کو اپنا شعار بنایا تو جس قدر ذلت و خواری ان قوموں کے حصے
میں آئی اس کی نظیر دوسری قوموں میں کم ہی ملتی ہے۔

(اشارات [illegible] ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۴۵ء)

[illegible] کو نظر انداز کر گئے بجز نہیں
کیا گیا بلکہ [illegible] موضوعات ہیں جن پر مرحوم
نے لکھا [illegible] دور جدید کے ان باطل نظریات
اور الحادی [illegible] کیا جس نے امت مسلمہ کے اخلاق اور
اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی روحانی
احساس سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ مرحوم مسلمانوں کے اس اخلاقی انحطاط
پر بہت دل گرفتہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں کئی بصیرت افروز
مضامین لکھے جن میں اس امر پر زور دیا گیا کہ انسان اپنے روحانی احساس کی

نگارشاتِ صدّیقی

نبئ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے چند جذباتی لمحات

زیرِ نظر مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتا اور منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم کو نبئ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس سے جو بے پایاں محبت و عقیدت تھی ان کی کتاب "لائف آف محمدؐ" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں حیاتِ طیبّہ کے ایسے پہلوؤں پر بھی لکھا جو کہ آج تک عاشقانِ رسولؐ کی نظروں سے یا تو اوجھل رہے یا پھر کم از کم سیرتِ رسولؐ کی انگریزی اور اردو کتب میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ مرحوم نے یہ مضمون تحریر فرما کر اس کمی کو پورا کر دیا۔

شعور کی طرح جذبہ انسانی زندگی کے لیے خداوند تعالیٰ کی ایک مستقل اور لازوال نعمت ہے۔ جب تک انسان سانس لیتا ہے جذبہ بھی اس کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ البتہ اس کی کیفیات، حالات، ماحول اور مزاج کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ ہلکی سی لے کی طرح انسان کے اندر ارتعاش پیدا کرتا ہے، کبھی یہ شدّت اختیار کر کے اس کی زندگی میں زلزلہ اور طوفان اُٹھاتا ہے، کبھی روحانی کیف و مستی کے زیرِ اثر آ کر قلندرانہ وجد و حال کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے کبھی یہ ایسی خاموش اور پرسکون روش اختیار کر لیتا ہے کہ اس کی حرکت و حرارت کا احساس تک نہیں ہوتا، لیکن یہ کسی نہ کسی صورت میں بہر طور موجود ضرور رہتا ہے۔

جب ایک عام انسان کے جذبے اور اس کی کیفیت کا صحیح ادراک بسا اوقات

انسانی دسترس سے باہر ہوتا ہے تو آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ افضل الانبیا، ختم المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جذبات کا احاطہ کیا جا سکے؟ اس بنا پر اس مضمون کو رسُولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نفسیاتی تجزیے کی قسم کی کوئی بے جا جسارت نہ سمجھا جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے شعور اور جذبات کا تجزیہ کسی انسان کے بس کی بات ہے بھی نہیں۔ انسانی نفسیات کا مبتدی بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ تجزیہ اسی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ انسانوں کے مابین مشترک جذبات ہونے کی وجہ سے اُن کے اظہار کے راستے بھی ایک دوسرے سے کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ اس لیے کسی دوسرے شخص کا جذباتی طرزِ عمل دیکھ کر ہم اپنے دِل کے اندر جھانکتے ہیں اور اُن محرکات کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں جو ہماری زندگی میں بھی اسی نوعیت کے طرزِ عمل کو جنم دیتے ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ قیاس پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی صحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے اعمال میں ہم آہنگی ہو۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ مماثلت اور ہم آہنگی نبی اور غیر نبی کے محرکات و اعمال کے مابین تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ غیر نبی کے محرکاتِ عمل میں دُنیوی آلائشیں بھی ہو سکتی ہیں جب کہ نبی کے محرکات بالکل پاکیزہ اور مُنزّہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خود اُن کے اِن مصفا چشموں کی حفاظت کا انتظام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک عام انسان غصّے کا اظہار کرتا ہے تو بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی انا کو کوئی ٹھیس پہنچی ہے یا اُس کے کسی مفاد پر کوئی ضرب لگی ہے۔ اس لیے ہم ان وجوہ پر غور کر کے اصل تحریکات کا کسی حد تک ادراک کر لیتے ہیں کیونکہ ہم خود بھی اس قسم کے حوادث سے دوچار ہو کر برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن نبی کی رنجش کے اسباب چونکہ عام انسانوں کے وجوہِ ناراضی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے کوئی غیر نبی اُن کا صحیح طور پر احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان نے، جو نبوت کے ارفع مقام کا کچھ بھی شعور رکھتا ہے۔ کسی نبی کے

نفسیاتی تجزیہ کی ہمّت نہیں کی۔ موجودہ دور کے نفسیات گزیدہ اپنے خبثِ باطن کو علم و تحقیق کے نام پر جس طرح چاہیں ظاہر کرتے رہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی نبی کا نفسیاتی تجزیہ بارگاہِ نبوت میں انتہائی گستاخانہ عمل ہے، کیونکہ یہ تجزیہ کرنے والا اپنے آپ کو حَکَم سمجھ کر اس مہم کا آغاز کرتا ہے۔ کیا کوئی مسلمان اِس زعم میں گرفتار ہو سکتا ہے کہ وہ نفس کی انگیخت اور شیطان کے وسوسوں سے مکمل طور پر بچ کر کسی نبی کی نفسیاتی کیفیات اور اس کے عمل کے محرکات کا پوری طرح ادراک کر کے مکمل عدل و انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ کوئی حکم لگا سکتا ہے؟ ایک مسلمان تو اس قسم کی جسارت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ "تحقیق" غارت گرِ ایمان ہے۔

ایک عام انسان اور نبی کے ارفع مقام کے درمیان جو امتیاز ہے، اُسے تسلیم کر لینے کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نبی چونکہ نوعِ بشری کی رشد و ہدایت کے لیے مامور ہوتا ہے اس لیے اس کا تعلق بنی نوعِ انسان ہی سے ہوتا ہے اور وہ انسانی داعیات کے ساتھ ہی انسانی معاشرے کے اندر اپنے مقدّس مشن کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ غم کے لمحات میں وہ دل گرفتہ اور بے چین ہوتا ہے، خوشی کے مواقع پر اس کا دل راحت اور آسودگی محسوس کرتا ہے، اعدائے دین کی چیرہ دستیاں اور دل آزاریاں اور راہِ حق سے انحراف کے لیے اُن کی ہٹ دھرمیاں اُسے رنجیدہ اور مغموم کرتی ہیں۔ رفقاء کی کوتاہیوں پر وہ ناگواری کا اظہار کرتا ہے اور ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر مسرور ہوتا ہے۔ الغرض بھوک، پیاس، علالت، عزیزوں اور دوستوں کی وفات، زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز، پریشانیاں اور المیے اُسے دوسرے انسانوں کی طرح ہی متاثر کرتے ہیں، مگر اِن اثرات کے ہجوم میں بھی وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو اُس کے عظیم مرتبہ سے فروتر ہو۔ وہ اِن حوصلہ شکن حالات میں بھی سیرت و کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے اور اُس مثالی طرزِ عمل کا اظہار کرتا ہے

جس کا حکم اُسے مالکِ کائنات نے دیا ہے۔ چنانچہ وہ خوشی کے موقع پر خوش تو ہوتا ہے مگر لہو و لعب میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے خالق کے سامنے سجدۂ شکر بجا لاتا ہے جس نے اُس کے لیے مسرت و شادمانی کا سامان پیدا کیا۔ اسی طرح وہ دُکھ اور مصائب میں رنجیدہ خاطر تو ہوتا ہے مگر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرتا بلکہ اُس قادرِ مطلق کی طرف رجوع کرتا ہے جو ناخوشگوار حالات پیدا کرنے اور تنگی کو فراخی میں بدلنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

جس طرح عقل کو زندگی سے خارج کر کے محض جذبات کے سہارے زندہ رہنا فطرت کے خلاف جنگ ہے، اسی طرح حیاتِ انسانی کو جذبات سے محروم کر کے یا اُنھیں پُوری طرح دبا کر جیسا کہ رواقیوں (Stoics) نے کیا، محض شعور اور آگہی کے بَل بوتے پر زندگی بسر کرنا انسانی جان کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہے۔ شعور و جذبہ دونوں کا زندگی میں اپنا اپنا مقام اور کردار ہے اور دونوں کے حسین امتزاج ہی سے زندگی میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اس مضمون میں حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پاکیزہ اور دلآویز زندگی کے جذباتی لمحات میں آپؐ کے خدا پرستانہ طرزِ عمل کی چند جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی والدہ محترمہ اور جدّ امجد کی وفات پر جس طرح دلگیر ہو کر آنسو بہائے اُس سے آپؐ کے جذبات کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر غارِ حرا میں جب جبرائیل امینؑ وحی لے کر پہلی بار حضورؐ کے سامنے ایک نورانی پیکر میں نمودار ہوئے تو آپؐ قدرتی طور پر خوف زدہ ہوئے کیونکہ آپؐ اُن کی ذات سے پہلے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ آپؐ گھبراہٹ کے عالم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گھر تشریف لائے اور اُنھیں فرمایا " زَمِّلُونِی " (مجھے کچھ اڑھاؤ)۔ جب کچھ دیر کے بعد گھبراہٹ دُور ہوئی تو آپؐ نے اپنی رفیقۂ حیاتؓ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ یہ سُن کر اُن سعادت مند خاتون نے جو آپؐ کے اوصافِ حمیدہ سے پُوری طرح واقف

اور آپؐ کی عظمت کی سب سے زیادہ معترف تھیں، یہ کہہ کر آپؐ کو تسلّی دی:

"آپؐ ہرگز خوف زدہ نہ ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے۔ خدا کی قسم مالک الملک آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپؐ صلۂ رحمی کرنے والے، راست گو، لوگوں کے بار اُٹھانے والے، ناداروں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنے والے ہیں۔ آپؐ امین ہیں اور مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہیں اور نامساعد حالات میں لوگوں کی اعانت اور دستگیری کرتے ہیں۔"

(بخاری و مسلم)

جب آپؐ نے حق کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا تو ہر طرف سے آپؐ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لیکن آپؐ خداوند تعالیٰ کی تائید کے سہارے پورے صبر و ثبات کے ساتھ یہ فرض سرانجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس اثناء میں ایک نازک مرحلہ ایسا بھی آیا، جس میں حضورؐ کے مربی اور کفیل جناب ابوطالب بھی قریش کے دباؤ کے تحت اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو دعوتِ دین کے کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ حضورؐ کی زندگی کے جذباتی لمحات میں یہ ایک نہایت ہی نازک لمحہ تھا۔ ایک طرف قریش کی مخالفت اور مخاصمت تھی اور دوسری طرف وسائل کی کمی اور پیارے چچا، جو دنیاوی سہاروں میں حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے لیے واحد طاقت ور سہارا تھے، کی مجبوریاں تھیں۔ ان صبر آزما لمحات میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر آپؐ اپنے چچا کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیتے تو اُن کی حفاظت اور کفالت سے محروم ہو جاتے اور پھر آپؐ کو قریش کی دراز دستیوں سے بچانے والی کوئی مؤثر شخصیت اُس معاشرے میں باقی نہ رہتی۔ ابن ہشام میں اس واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے۔ جب قریش نے نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی تبلیغی سرگرمیوں پر، اور اُن سے جو نقصان اُن کے آبائی دین کو پہنچ رہا تھا، اس پر جناب

ابو طالب سے شکایت کی تو اُنھوں نے حضورؐ کو بُلایا اور محبت بھرے لہجہ میں کہا:

"اے جانِ برادر! تمھارے قبیلے کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور اُنھوں نے مجھ سے اس طرح کی باتیں کیں (اور وہ باتیں بیان کیں جو اُنھوں نے کہی تھیں) خدارا مجھ پر رحم کرو اور خود اپنی جان پر بھی رحم کرو۔ مجھ پر ایسا بار نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہوسکتا۔"

راوی کا گمان ہے کہ رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کچھ ایسا احساس ہوا کہ اُن کے چچا اُن کی دستگیری سے اب مجبوراً دست کش ہو رہے ہیں اور ظالموں اور آپؐ کے درمیان وہ حائل نہ رہیں گے۔ حضورؐ کی زندگی کا یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ ایک طرف کفر کی طاقت اور عداوت تھی تو دوسری طرف دنیوی اعتبار سے بے بسی اور بے سرو سامانی۔ اِن حالات میں جو واحد سہارا تھا وہ بھی اب ہمّت ہار کر الگ ہونا نظر آرہا تھا۔ حضورؐ نے اس اندوہناک صورتِ حال کو شدّت سے محسوس کیا اور آپؐ کا دِل بھر آیا اور آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ یہ ایک فطری عمل تھا لیکن غم واندوہ کے ان لمحات میں بھی آپؐ نے خداوند تعالیٰ کے سہارے ہی کو اپنے لیے سب سے زیادہ مضبوط سہارا سمجھا اور عزم و یقین کے ساتھ فرمایا!

يَا عَمِّ وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِيْنِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى أَنْ أَتْرُكَ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ أَوْ أَهْلِكَ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهُ،

ابنِ ہشام جلد ا ص ۲۶۶

"چچا جان قسم ہے خدا کی اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج بھی رکھ دیں اور بائیں ہاتھ پر چاند (اور مجھ سے اس کام سے باز رہنے کا مطالبہ) کریں تو میں

اسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اسے غالب کر دے یا میں (اس جدوجہد) میں اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کر دوں۔

جناب ابو طالب حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ سے بڑے متاثر ہوئے اور کہا: "جانِ عزیز! جہاں جس طرح تمھارا جی چاہتا ہے دعوتِ دین کا کام کرتے رہو۔ میں تمھاری معاونت سے کبھی دست بردار نہ ہوں گا۔"

حضورؐ نے اپنے چچا کے ان احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا۔ دُنیاوی معاملات میں بڑی خوش دلی سے اُن کا ہاتھ بٹایا، روپے پیسے سے اُن کی مدد کی، اُن کے بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر توجہ دی، اُن کے سامنے ہر موزوں موقع پر دین کی دعوت پیش کی تاکہ وہ مسلمان ہو کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔ حضورؐ اپنے چچا کی آخرت سنوارنے کے بارے میں کس قدر فکر مند تھے، اس کا اندازہ حضورؐ کی اُس پُرزور التجا اور دُعا سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ نے جناب ابوطالب کی وفات کے وقت اُن کے سامنے کی اور اُن کی وفات کے بعد خدا کے حضور میں اُن کی مغفرت کے لیے کرتے رہے۔ اس التجا اور دُعا میں حضورؐ کے اپنے چچا کے بارے میں جذبات کی اچھی طرح عکاسی ہوتی ہے۔

مسند احمدؒ، بخاری، مسلم اور نسائی میں ہے کہ جب جناب ابوطالب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ کے پاس تشریف لے گئے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن اُمیہ بھی وہاں موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا چچا جان، آپ ایک مرتبہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه تو کہہ دیجیے تاکہ مجھے خدا کے سامنے آپ کی شفاعت اور سفارش کے لیے ایک حجت اور دلیل مل جائے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن ابی اُمیہ باپ کے دین کا واسطہ دے کر اُنھیں کلمۂ شہادت پڑھنے سے تاکیداً باز رکھتے رہے اور حضورؐ بار بار اُنھیں

زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرنے کی التجا کرتے رہے۔ مگر وہ نہ مانے اور اُنھوں نے عبدالمطلب ہی کے دین پر دنیا سے رُخصت ہونا پسند کیا، اُن کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کے لیے مسلسل دُعائے مغفرت مانگتے رہے یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔

حضورؐ اپنی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی بڑا جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ اُن کی معاونت اور دستگیری کو حضورؐ نے ہمیشہ یاد رکھا۔ جب اُنھوں نے وفات پائی تو آپ بڑے آزردہ خاطر ہوئے۔ ان کے دنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد حضورؐ کے دل میں اُن کی محبت اور احترام آخری دم تک موجود رہا۔ جب کبھی اُن کا ذکر آتا تو آپؐ مغموم ہو جاتے اور بسا اوقات آپؐ کے جذبات خلیجِ چشم سے آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلتے۔ جب کبھی اُن کی کوئی چیز سامنے آتی تو آپؐ کا دل بھر آتا۔ حضرت ابوالعاص جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے اور داماد تھے جنگِ بدر میں گرفتار ہوئے اور اہلِ مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ روانہ کیا تو حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابوالعاص کے فدیے میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شادی کے وقت اُنھیں دیا تھا۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُس ہار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور صحابہؓ سے فرمایا: "اگر مناسب سمجھو تو اس ہار کو واپس کر دو اور اُس قیدی کو چھوڑ دو۔" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے کہ مجھے حضورؐ کی ازواجِ مطہرات میں کسی اور زوجۂ محترمہ پر اتنا رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر۔ حضورؐ اُن کی سہیلیوں کو وقتاً فوقتاً تحائف بھیجتے اور ان کا کثرت سے تذکرہ فرماتے۔ ایک مرتبہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے "آپؐ کے دل و دماغ پر تو خدیجہؓ ہی چھائی رہتی ہیں۔" اس پر آپؐ رنجیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا: "ہاں

اُن کی محبت کی خود اللہ نے میرے دل میں آبیاری کی ہے۔ وُہ مجھ پر اُس وقت ایمان لائیں جب دوسرے لوگوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ جب لوگوں نے میرے دعوےٰ نبوت کو جھٹلایا تو اُنھوں نے میری تصدیق کی۔ جب دوسرے لوگوں نے مجھے ہر چیز سے محروم رکھنے کی کوشش کی تو اُنھوں نے میری دست گیری کی۔ لہ"

جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات سے حضورؐ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ آپؐ نے ان کے سالِ وفات کا نام ہی عام الحزن رکھ دیا تھا۔ لیکن ان المناک حوادث سے دوچار ہونے کے باوجود آپؐ دعوتِ دین کے لیے پاپیادہ ہی مکے سے نکل کھڑے ہوئے اور طائف تک راستے میں جتنے قبائل آباد تھے سب کو اللہ کا پیغام سُناتے چلے گئے۔ طائف پہنچنے پر آپؐ وہاں کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب سے ملے اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ اُن میں سے ایک بولا: میں کعبہ کے سامنے داڑھی منڈوا دوں گا اگر اللہ نے تجھے رسُول بنایا ہو۔ دوسرے نے کہا: کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور رسُول بنانے کو نہ ملا جس کو سواری تک میسّر نہیں۔ اُسے اگر رسُول بنانا ہی تھا تو کسی حاکم اور سردار کو بناتا۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُن کی اس طعنہ زنی اور بے ہودہ باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور تبلیغ دین میں برابر منہمک رہے۔ اس سے یہ سردار جھلّا اُٹھے اور اُنھوں نے شہر کے چھوکروں اور اوباش لوگوں کو حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تنگ اور زچ کرنے پر اُکسایا۔ چنانچہ عقل کے اِن اندھوں نے آپؐ کو گالیاں دیں، تالیاں پیٹیں اور آپؐ پر پتھر پھینکے۔ آپؐ اس سنگ باری کے باعث لہو سے تر بتر ہو گئے۔ خون بہہ بہہ

لہ یہ الفاظ بخاری، مسلم اور مسند احمد بن حنبلؒ سے جمع کیے گئے ہیں۔

کر جوتوں میں جم گیا اور وضو کے لیے پاؤں جوتے سے نکالنا مشکل ہو گیا۔ اس سفر میں آپؐ کو بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ایک شخص بھی مسلمان نہ ہوا۔ اِن حوصلہ شکن حالات میں جب ایک مقدس ہستی بھٹکے ہوئے لوگوں کو حق کی راہ دکھا رہی ہو اور وہ اس کے بدلے میں گالیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کر رہے ہوں اور اس کی زندگی کے درپے ہوں، انسان کے دِل پر جو گزرتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ آدمی رنجیدہ خاطر ہوتا ہے، اس ظلم کے خلاف اُس کے دِل سے آہ نکلتی ہے، وہ ظالموں کو کوستا ہے اور انسان اس انداز پر سوچنے لگتا ہے کہ کیوں نہ حق کے اِن باغیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور خدائی فیصلے کا انتظار کیا جائے؟ مگر اِن حالات میں رحمۃ اللعالمینؐ نہ تو برہم ہوئے نہ مایوس بلکہ اپنے رب کے حضور یوں دُعا گو ہوئے:

اللّٰھم الیك اشکو ضعف قوتی وقِلّۃَ حیلتی وھوانی علی النّاس یا ارحم الراحمین انت رَبُّ المُستَضعَفِینَ وانت ربی۔ اِلٰی من تکِلُنی؟ الٰی بعید یتجھمنی؟ ام اِلٰی عَدُوٍّ ملکتہ امری؟ اِن لم یکن بك غَضَب علیّ فلا ابالی غیر انّ عافیتك ھی اوسع لی۔ اعوذ بنور وجھك الذی اشرقت لہ الظلمت وصلح علیہ امر الدنیا والاٰخرۃ: ان یَحُلَّ علیَّ غَضَبُكَ اَوْ ان ینزل بی سخطُكَ لكَ العُتبیٰ حتی ترضی ولا حول ولا قوۃ اِلا بك۔ (زاد المعاد جلد۲ ص ۱۲۳/۱۲۴)

الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر پر تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آئے؟

یا کسی دشمن کو میرے اُوپر قابو دے رکھا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے پھر کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر اُترے یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضا اور خوشنودی درکار ہے، اور کوئی طاقت تیری طاقت کے سوا نہیں ہے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس قدر غمگین و رنجیدہ دیکھ کر جبرائیل امین تشریف لائے اور کہا: آپؐ کی قوم نے آپ سے جو ناروا سلوک کیا ہے اللہ نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ اگر آپؐ چاہیں تو ان ظالموں کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس دیا جائے۔ لیکن اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ جواب دیا کہ:

"نہیں ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔ مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ مولائے کریم ان کی نسلوں میں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے۔ (زاد المعاد از ابنِ قیم جلد دوم صـ۱۲۴)

رحمۃ للعالمینؐ کی محولہ بالا دُعا اور دینِ حق کے دشمنوں اور اپنے خون کے پیاسوں کے بارے میں آپؐ کی یہ سفارش دونوں اتنی اثر انگیز ہیں جن سے آپؐ کی ذاتِ اقدس سے سخت کد رکھنے والا عیسائی سوانح نگار ولیم میور بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اُسے مجبوراً حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دعوائے نبوت کی صداقت کا یوں اعتراف کرنا پڑا۔

"محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جس انداز سے طائف کی طرف روانہ ہوئے وہ عظمت اور حوصلہ مندی کی تصویر ہے۔ ایک تنہا اور بے یار و مددگار شخص جسے اپنے اقرباء تک نے نفرت و حقارت

کے ساتھ ٹھکرا دیا ہو، کمال جرأت کے ساتھ خداوند تعالیٰ کے
بھروسے پر اسی شان کے ساتھ طائف کی طرف روانہ ہوتا ہے
جس طرح یونس بن متی نے نینوا کی طرف رختِ سفر باندھا تھا
اہلِ شہر کو جو شرک و کفر میں پوری طرح ملوث تھے رجوع الی اللہ
اور اپنے مشن کی حمایت کی دعوت دیتا ہے۔ اس امر سے یہ
حقیقت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اُن کو اپنے
مامور من اللہ ہونے پر پورا اعتماد اور یقین تھا۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جان نثارؓ شعبِ ابی طالب میں
مسلسل تین سال تک محصور رہے اور اس مدت میں قریش نے جس طرح
اُن پر عرصہ حیات تنگ کیا وہ ایک دل ہلا دینے والی داستان ہے۔ مگر حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے خداداد بصیرت کے ذریعہ رنج و محن کے ان سالوں
کو بھی تربیت کا دور بنا دیا اور شعبِ ابی طالب کی تربیت گاہ میں ساتھیوں
کی اچھی طرح تربیت کی تاکہ مستقبل قریب میں اُنھیں جس قسم کی مشکلات
پیش آنے والی ہیں وہ اُن سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکیں، جو ہستی بھوک،
پیاس، معاشرتی مقاطعہ اور قید کے لرزہ خیز مصائب کے اندر اپنے رفقاء
کے حوصلے بلند رکھنے کا التزام کرتی ہے اور اِن کے ذریعہ اُن میں سیرت و
کردار کی پختگی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے، وہ کس قدر عظیم ہو گی؟

قریش نے جب یہ دیکھا کہ حضورؐ اور آپؐ کے فدائیوں کے خلاف
ترغیب و ترہیب کا کوئی ہتھیار کارگر ثابت نہیں ہو رہا اور دعوتِ دین کا
کام اُن کی ساری ستم رانیوں کے باوجود مسلسل آگے بڑھ رہا ہے تو وہ حضورؐ
کے قتل کے درپے ہوئے۔ اِدھر حضورؐ سرورِ دو عالم نے بھی حالات کی

---

[1] لائف آف محمدؐ صـ ۱۰۶

نزاکت کو پوری طرح بھانپ لیا اور یہ محسوس کر لیا کہ سرزمینِ مکہ دینِ حق کو ایک اجتماعی قوّت میں ڈھالنے کے لیے موزوں نہیں، اس کے کے لیے کسی اور جگہ کی تلاش ضروری ہے۔ چنانچہ آپؐ نے مکّہ سے مدینہ منورہ ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کفار مکّہ کو بھی آپؐ کے اس ارادے کا علم ہو گیا اور انھوں نے ہر قبیلہ کے ایک ایک آدمی کو جمع کر کے انھیں یہ حکم دیا کہ وہ ہادیٔ برحق صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایک ساتھ حملہ کر کے (معاذ اللہ) ان کا کام تمام کر دیں تاکہ وہ چشمۂ عرفان ہی باقی نہ رہے۔ جبرائیل امین کے ذریعہ حضورؐ کو بھی اُن کے اِن ناپاک عزائم کی اطلاع ہو گئی۔ جس رات حضورؐ نے مکّہ چھوڑنے کا ارادہ کیا وہی رات اعدائے دین نے حضورؐ پر قاتلانہ حملے کے لیے منتخب کی۔ اِن حالات میں حضورؐ کی جذباتی کیفیت پر غور کریں۔ جس سرزمین میں آپؐ نے جنم لیا، عہد طفولیت گزارا، جوان ہوئے، رشتہ مناکحت استوار کیا، نبوت سے سرفراز فرمائے گئے اور جس میں قدم قدم پر آپؐ کے بزرگوں کی یادگاریں موجود تھیں اور سب سے بڑھ کر جو خطّۂ ارضی بیت اللہ کی موجودگی کی وجہ سے روحانیت کا مرکز و محور تھا، اُسے حضورؐ محض خالقِ کائنات کی خوشنودی کی خاطر خیرباد کہہ کر ایک اجنبی جگہ اور اجنبی ماحول میں آباد ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ مکّہ کو الوداع کہتے ہوئے حضورؐ کی قلبی کیفیت کا اندازہ اِن الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ نے اس موقع پر ارشاد فرمائے:

وَاللهِ انك لخير ارض اللهِ واحب ارضٍ الى الله ولو
لا انی اُخرجت عنكِ ماخرجت (ترمذی)

خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے اور سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے۔ اگر میں نکالا نہ جاتا تو کبھی نہ نکلتا۔

مااطيبكِ من بلدٍ واحبّكِ اِلَيّ وَلولا ان قومی اخرجونی

ما سکنت غیرک (احمد و ترمذی)

تو کیا ہی پاکیزہ شہر ہے اور مجھ کو بڑا ہی محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھ کو نہ نکالتی تو میں دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔

پھر شہر سے نکلنا بھی انتہائی پُرخطر تھا۔ خواب گاہ کو خون کے پیاسوں نے اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا کہ کوئی جائے فرار نہ تھی۔ الغرض ہر طرف آلام اور تفکرات ہی تھے۔ گھر بار چھوڑنے کا غم، قرابتداروں کی جدائی کا غم، اپنے کمزور اور بے بس جانثاروں کے ظالموں کی تحویل میں رہ جانے کا غم، بیت اللہ سے بُعد اور دُوری کا غم اور دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے مختلف قسم کی پریشانیاں اور اندیشے لاحق تھے اس قسم کے المناک حالات میں بھی اللہ کے برگزیدہ نبیؐ نے سکونِ خاطر برقرار رکھا۔ اس امینؐ کے پاس جو امانتیں رکھی ہوئی تھیں انھیں اپنے عم زاد بھائی کے ذریعہ اُن کے مالکوں تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام فرمایا اور بڑے وقار اور اعتماد کے ساتھ اپنے فدائی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریش کو جب اپنے منصوبے کی ناکامی کا علم ہُوا تو اُنھوں نے آپؐ کے تعاقب میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے حتیٰ کہ وہ ایک غار کے دہانے تک جا پہنچے جہاں آپؐ پناہ گزین تھے۔ اس اثناء میں آپؐ کے جانثار رفیقؓ نے گھبرا کر کہا "حضورؐ، ان میں سے اگر کسی کی نظر اپنے قدموں پر پڑ جائے تو ہم اس کی نگاہ سے بچ نہ سکیں گے۔" آپؐ نے اُنھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

یا ابابکر ماظنک باثنین اللّٰہ ثالثھما۔

اے ابوبکر اُن دو آدمیوں کے متعلق تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔

نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا:
لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا
تو بالکل غم نہ کھا یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ خدمتِ خلق

زیرِ نظر مضمون جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم نے پبلک ویلفیئر سوسائٹی گوجرانوالہ کے اجلاس منعقدہ ۱۶ جولائی ۱۹۶۱ء میں پڑھا۔ یہ مختصر مضمون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبۂ خدمتِ خلق کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔

انسان کو اگرچہ اس دُنیا میں پیدا تو فرد کی حیثیت سے ہی کیا گیا ہے مگر اُسے اس کرۂ ارض پر اکیلا رکھا نہیں گیا۔ اُسے حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں اُتار کر، مختلف انسانی تعلقات میں باندھ کر، لاتعداد ذمہ داریوں کا بوجھ اُس کی کمر پر لاد کر، ان گنت امانتوں کا امین بنا کر خوف اور لالچ، محبت اور غضب، امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں پروان چڑھا کر، اُس سے اس امر کا تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ آخرت کی فلاح و کامرانی کے لیے جدوجہد کرے۔ ایک مسلمان کی منزلِ مقصود بلاشبہ روحانی ہے اور اسی کے حصول کے لیے اُسے خداوند تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے ترغیب و ترہیب دی ہے لیکن چونکہ اس منزل کا راستہ دنیاوی علائق سے ہی گزر کر جاتا ہے اس بناء پر خداوند تعالیٰ نے اصلاح عقائد کے ساتھ ساتھ ان کی درستی کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عقائد اور عبادات کی درستی کا صحیح معیار یہی ہے کہ انسان دوسرے ابنائے نوع سے متعلقہ ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔

قرآن مجید میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کو فرداً فرداً خدا کے حضور میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے پیش ہونا ہے مگر چونکہ خدا کے سامنے اس کی جوابدہی بہت بڑی حد تک اجتماعی حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے اور آخری امتحان کی کامیابی

کے لیے اس کا تیار ہونا بجائے خود اجتماعی اصلاح و فلاح پر منحصر ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان فرائض کی بجا آوری میں قطعاً کوتاہی نہ کی جائے۔ نیکی، تقویٰ اور پرہیزگاری کا جو تصوّر اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر لحاظ سے بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکارِ دو عالم نے انسانی حقوق کے معاملے میں نوعِ بشر کو ہر طریق سے بیدار کیا ہے۔ انھوں نے وعظ و نصیحت سے، خود اپنے عمل سے اور بعض مقامات پر ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعہ بھی ان کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ اس بناء پر ان حقوق کی حفاظت و پاسبانی حیاتِ انسانی کا اصل مقصد ہے، جو شخص ان حقوق سے صرفِ نظر کر کے زندگی کے مستعار لمحات کو کسی خلوت کدے میں گزار دیتا ہے، وہ کسی دوسرے مذہب کی نظر میں ایک اونچے درجے کا انسان ہو تو ہو، مگر اسلام کی نظر میں کوئی اہمیّت نہیں رکھتا۔

اسلام ایک ایسی انقلاب انگیز قوت فکر و عمل ہے۔ جس کے پیشِ نظر صرف فرد کی فلاح نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے، اور اس مقصد کے حصول کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہم انسانی تعلّقات میں استواری پیدا کریں۔ تہذیبِ اسلامی کا اصل مسئلہ انسانوں کے باہمی تعلّقات میں توازن و اعتدال پیدا کرنے کا مسئلہ ہے اور اس کے صحیح حل پر ہی اس تہذیب کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک ہم نوعِ انسانی کے حقوق کی بجا آوری میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور ان کے مقدّس رفقاء کار کی پیروی نہیں کرتے ہم اسلامی تہذیب کو دُنیا میں ایک غالب تہذیب بنانے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

حضورؐ سرورِ کائنات انسانی حقوق و فرائض کے معاملے میں کس قدر حسّاس تھے اس کا اندازہ سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی اور آپؐ نے گھر آ کر حیرانی کے عالم میں اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر فرمایا

تو اُن کی زبان مبارک سے آپؐ کے حق میں جو تعریفی جملہ نکلا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت نوازی پر پوری طرح دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الوحی میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلّی دیتے ہوئے آپؐ کی شان میں مندرجہ ذیل الفاظ فرمائے۔

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی بھی رسوا نہ کرے گا۔ آپؐ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اُوپر لیتے ہیں، محتاجوں کے لیے کماتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور راہِ حق میں مصائب و شدائد برداشت کرتے ہیں"۔

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کرنا چاہی تو اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر ارشاد فرمائی اُس میں بھی انسانیت نوازی کا یہی پہلو اصلاحِ عقائد کے ساتھ پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بُتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ زبردستوں نے زیردستوں پر دستِ ظلم دراز کر رکھا تھا۔ اس اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا۔ جس کی نسبت، سچائی، امانت اور پاکدامنی کو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اُس نے ہمیں سکھایا کہ ہم پتھروں کی پُوجا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی اور زیردست آزاری سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں اور عفیف عورتوں پر تہمتیں نہ لگائیں[1]"

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابو سفیان نے جو ابھی تک کافر تھے۔ آنحضرت

---

[1] ابنِ ہشام جلد تمہ ۱۰۲

صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت اصلاح و تبلیغ کا جو مختصر نقشہ کھینچا۔ اس میں یہ تسلیم کیا کہ حضورؐ سرورِ کائنات نے عقائد و عبادات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی التزام فرمایا ہے۔ کہ لوگ پاکدامنی اختیار کریں۔ سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں ؎۲

اِن حقوق کی صحیح طور پر حفاظت اور بجا آوری اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنے پہلو میں ایک حساس دِل رکھتا ہو، ایسا دِل جس میں دوسروں کا دُکھ درد ارتعاش پیدا کر سکے۔ اور اس کے اندر ایثار کا اتنا جذبہ بھی موجود ہو کہ وہ اس میدان میں عملی جد و جہد کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ جس شخص کے اندر یہ دو بنیادی صفات پیدا نہیں ہوتیں وہ کبھی بھی صحیح معنوں میں خدمتِ خلق کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کو حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے مثلاً ایک مسلمان کی قلبی کیفیات کی مندرجہ ذیل الفاظ میں صراحت کی ہے:

"مومن محبّت و الفت کا پُتلا ہے اور جو نہ محبّت کرتا ہے اور نہ اُس سے محبت کی جاتی ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر یُوں فرمایا:

"جو نرمی سے محروم کیا گیا وہ بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔"

اس بات کی مزید تشریح یُوں فرمائی:

"جس شخص کو نرمی میں سے اس کا حصّہ دیا گیا اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی میں اس کا حصّہ دے دیا گیا۔"

ایک اور مقام پر یہ ارشاد فرمایا:

"جو رحم کرنے والے ہیں، رحمٰن اُن پر رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں

؎۲ صحیح بخاری

پر رحم کر دتا کہ آسمان والا تم پر رحم کرے۔"

دیکھئے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رحم کو دل و دماغ کے ایک وقتی تاثر سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اسے انسانی سیرت کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانیت کو عملی جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ جس دل میں دوسروں کے مصائب دیکھ کر تڑپ اُٹھنے کی صلاحیت ہے اُس سے کبھی اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس شخص کے اندر ان مصائب کو دُور کرنے کا ولولہ پیدا نہ کرے۔ اُس کا احساس ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ دوسروں کی پریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھے اور ان سے انھیں نجات دلانے کی اس طرح فکر کرے جس طرح کہ وہ خود اپنے معاملے میں کرتا ہے۔ مومن کے کردار کی اس صفت کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی ایک لازمی شرط ٹھہرایا ہے ! آپ کا فرمان ہے۔

وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَا یُوْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

سیرت کی کتابوں میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کار کے اندر اس جذبہ کی آبیاری کے لیے کس قسم کی سعی کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا کہ لوگوں میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا،

"لوگوں میں اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو انسانوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔"

ایک دوسری جگہ پر حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی اہمیت یوں بیان فرمائی:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں سے کہے گا کہ اے بندے میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا کیوں نہ کھلایا اور یہ کہ میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا کیوں نہ دیا اور میں مریض تھا تو نے میری عیادت کیوں نہ کی"

قرآن مجید میں بھی ان انسانی حقوق کی بجاآوری پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَفِی اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات - ۱۹)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج ۲۵)

اور اُن کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (بنی اسرائیل ۲۶)

اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر۔

مندرجہ بالا آیات اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ اعانت اور حسن سلوک کا ایک بہت بڑا حصّہ مال پر عائد ہوتا ہے اور یہ کہ محروم آدمی اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے حصّہ وافر دیا ہے وہ محروم کی مدد کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسی حق کو انتہائی بلیغانہ انداز میں یوں پیش فرمایا ہے:

مخلوق خدا کا کنبہ ہیں، پس خدا کے نزدیک اس کی مخلوق میں سے محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کنبے سے حسن سلوک کرے۔ (بیہقی عن عبداللہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے اپنی سنگدلی کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا: "یتیم کے سر پہ ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھِلا"

فریادی کی دادرسی بھی چونکہ خدمتِ خلق کا ہی ایک شعبہ ہے اس لیے اس کے بارے میں بھی تاکید فرمائی:

"جس نے کسی فریادی کی داد رسی کی اللہ نے اس کے لیے تہتر بخششیں لکھ دیں۔ اُن میں سے ایک بخشش اس کے تمام کاموں کی اصلاح کی ضامن ہے اور بہتر بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات بلند کرنے کا سبب بنیں گی۔"

اسی طرح کسی بیوہ اور مسکین کی اعانت اور دستگیری کرنے والوں کے متعلق یہ فرمایا:

"بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنیوالا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔"

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو انسانی ہمدردی کا ہر لحاظ سے مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا طبقہ ہے۔ یہ چونکہ اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت خود نہیں کر سکتے اس لیے حضور سرور دو عالمؐ نے ان کے بارے میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں اور مسلمانوں کو اس امر کی تاکید فرمائی ہے کہ وہ مریضوں کی عیادت کریں، پھر حضورؐ نے عیادت کے آداب بتائے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے۔

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے خدا اُس کے غم کو ہلکا کرے گا"۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا ہے جن میں ایک بیمار کی عیادت ہے۔ ارشاد ہوا "کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اُس کی مغفرت کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرتے ہیں اور پھر یہ بھی کہ جو شخص مریض کی عیادت کو جاتا ہے وہ رحمت کے دریا میں داخل ہو جاتا ہے اور جب مریض کے پاس بیٹھتا ہے تو رحمت اس کا احاطہ کر لیتی ہے (مشکوٰۃ)

اس سلسلے میں آپ نے اس بات کی بھی ہدایت فرمائی:

"مریض کی عیادت کی تکمیل یہ ہے کہ عیادت کرنے والا اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ یا پیشانی پر رکھ دے اور اس سے پوچھے کہ وہ کیسا ہے"
(احمد و ترمذی عن ابی امامہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کے جو آداب بتائے ہیں ان میں سے ایک اہم چیز مریض کی تسلّی و تشفی بھی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم یوں دیا ہے:

"جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اس کو تسلّی اور تشفی دو۔ یہ اگرچہ حکم الٰہی کو تو نہیں روک سکتی لیکن مریض کے دِل کے لیے مسرت کا باعث ضرور بنتی ہے"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود جب کسی کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر تسلّی دیتے اور فرماتے لا باس طہور ان شاء اللہ اور پھر اس سے پُوچھتے کہ کسی خاص چیز کو اس کا دِل چاہتا ہے، اسی طرح حضورؐ نے اس بات سے بھی منع فرمایا ہے کہ مریض کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھا جائے یا شور و غل کیا جائے۔

اِسلام میں صدقہ و اِحسان کی اہمیّت

زیر نظر مضمون میں جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں صدقہ و احسان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس مضمون میں مرحوم نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جب انسان کا رشتہ حیات ٹوٹ جاتا ہے تو سوائے تین اعمال کے تمام اعمال کا تعلق اس سے منقطع ہو جاتا ہے: (۱) صدقہ جاریہ، (۲) نفع بخش علم اور (۳) دعائے خیر کرنے والا نیک بچہ۔ مرحوم کی ذاتِ گرامی کو جب اس حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ تینوں اعمال ان میں بدرجہ اُتم پائے جاتے ہیں۔ مرحوم کئی طلباء اور دیگر حاجت مندوں کی مالی معاونت فرماتے تھے۔ کئی علمی اور دینی کتب کے بلند پایہ مصنف تھے جن سے تشنگان علم فیض اٹھا رہے ہیں۔ مرحوم اگرچہ اولاد نرینہ سے محروم رہے لیکن ان کی بچیاں اپنے باپ کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ وہ مرحوم کو ان نیک اعمال اور صدقات کا اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

اسلام نے زکوٰۃ وغیرہ کے جو قوانین و حقوق مقرر کیے ہیں وہ ان سب سے بڑھ کر جود و سخا کرنے والے انسان کے دل کو ایک ایسے آدمی کا دل بنانا چاہتا ہے جو طلب سے کہیں زیادہ دیتا ہے اور جتنا اس پر خرچ کرنا واجب ہو اس سے کہیں زیادہ خرچ کرتا ہے بلکہ بے طلب و سوال عطا کرتا ہے اور خوشحالی و بدحالی میں شب و روز پوشیدہ طور پر اور علانیہ خرچ کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کرتا

ہے جو خود اُسے اپنے لیے پسند ہو۔ بلکہ باوجود اپنی تنگ دستی کے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے اور مال کو مقصد نہیں بلکہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے، وہ مال کو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا ایک ذریعہ تصوّر کرتا ہے۔ اس کا دل خیر و خوبی کا مرقّع بن جاتا ہے۔ وہ رضائے الٰہی اور ثواب کی نیّت سے نہ کہ حُبِّ جاہ و شہرت کی خاطر یا حاکمِ وقت کی سزا کے خوف سے، خوب دل کھول کر خرچ کرتا ہے،

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چند قوانین اور قواعد وضوابط ہی سب کچھ ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں وُہ سطح بین ہیں اور انسان کی حقیقت سے ناآشنا۔ انسان کوئی مشین نہیں ہے کہ اُسے گھومایا جائے تو وہ گھومنے لگے۔ کوئی پہیّہ نہیں ہے کہ اُسے حرکت دی جائے تو وہ متحرک ہو جائے اور روکا جائے تو رُک جائے، وہ تو ایک ایسا پیچیدہ ڈھانچہ ہے جو مادّہ اور رُوح، جسم اور جان، عقل اور جذبات اور افکار و احساسات سے مرکّب ہے۔ وہ تو ایک ایسا وجود ہے جو سوچتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ جو کسی چیز کو محسوس کرتا ہے اور اس کا شعور حاصل کرتا ہے جو بعض چیزوں کو اختیار کرتا ہے اور اُنھیں دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا ہے اور بعض کاموں کو کرتا ہے اور بعض کو ترک کرتا ہے اور بعض چیزوں یا لوگوں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اُن پر اثر انداز بھی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس وجودِ انسانی کے جملہ خصائص کا لحاظ رکھا جائے اور اس کے سازِ زندگی کے سارے تاروں پر زخمہ زنی کی جائے تاکہ ہم اس کے اخلاق اور ضمیر کے ذریعے زندگی کے دوسرے قوانین اور قواعد وضوابط کی کمی کو پُورا کر سکیں۔

اسلام بحیثیت ایک دین ہونے کے صرف اُن حقوق پر توجہ دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا جو کچھ قوانین وضوابط کے تحت ہیں اور جن کے نفاذ کی ذمہ داری حکومتوں پر ہوتی ہے بلکہ انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو پر بھی توجہ دیتا ہے کیونکہ زندگی کا ہر پہلو اسلام کی نظر میں صرف کفالتِ باہمی کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ نیک رضائے الٰہی اور جنّت میں انبیاء کی رفاقت کے طالب انسان

کی تربیت سے جو مقاصد اسلام حاصل کرنا چاہتا ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

یہاں ہم کچھ آیاتِ قرآنی اور کچھ احادیثِ نبویؐ نقل کرتے ہیں جو بشارت و انذار، ترغیب و ترہیب، دعوتِ انفاق فی سبیل اللہ اور بخل و کنجوسی سے احتراز کی دعوت سے عبارت ہیں۔ جو فنّی اعتبار سے اتنی اعلیٰ اور ادبی لحاظ سے اتنی بلیغ ہیں کہ اُن کی وعید جامد دلوں کو موم کر دیتی ہے اور اُن کے وعدے (یعنی اُن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جنّت اور دیگر آرام و آسائش کے جو وعدے کیے ہیں) بند مٹھیوں کو حرکت میں لے آتے ہیں اور بھلائی اُن سے پھوٹ نکلتی ہے اور جود و سخا کے لیے وُہ کھل جاتی ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۴۵)

تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور اُسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَـنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ ۲۶۱، ۲۶۲)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے نہ دُکھ دیتے ہیں اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ، ۲۷۴)

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے۔ اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔

وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ۔ (آل عمران: ۱۳۳، ۱۳۴)

دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اُس جنّت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیّا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ۔ وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۔

اے نبی! ان سے کہو میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے، جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے۔ وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ۔ (الحدید: ۷)

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ، وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (الحشر: ۹)

اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گیے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ

رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (المنافقون)

خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے روزی دی تم کو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ تو پھر کہے اے میرے رب! کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو تھوڑی مدت کے لیے کہ میں خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا۔

اور جو نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے۔ اس کو خدا کے ہاں بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ۔ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ۔ (البلد ۱۱-۱۸)

مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، یتیم رشتہ دار کو یا فقیر خاکسار کو۔ پھر اُن لوگوں میں بھی داخل ہُوا جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور (لوگوں پر) شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے۔ یہی لوگ صاحبِ سعادت ہیں۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا۔ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا۔ (الدھر: ۸-۱۰)

اور باوجودیکہ اُن کو خود طعام کی خواہش اور حاجت ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکر گزاری کے طلب گار۔ ہم کو اپنے پروردگار

سے اس دن کا ڈر لگتا ہے جو (چہروں کو) کریہ المنظر اور (دلوں کو) سخت مضطر کر دینے والا) ہے۔

احادیثِ نبوی ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بندہ کہتا ہے میرا مال۔ اس کا مال تو صرف وہ ہے جو اُس نے کھا لیا اور ختم ہو گیا اور جو اُس نے پہن لیا اور بوسیدہ ہو گیا اور جو اُس نے راہِ خدا میں دے دیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی اُس کے پاس ہو گا وُہ اسے دوسرے لوگوں کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ (مسلم)

حضرت ابنِ مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارثوں کا مال خود اپنے مال سے زیادہ پیارا ہے؟" صحابہؓ نے کہا "اے اللہ کے رسُول! ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے اپنا مال زیادہ پیارا نہ ہو" آپؐ نے فرمایا "بے شک تم میں سے ہر ایک کا اصل مال وہ ہے جسے تم راہِ خدا میں خرچ کر کے اللہ کے ہاں ذخیرہ کر لو۔ اور وارثوں کا مال وہ ہے جسے تم پیچھے چھوڑ جاؤ۔ (النسائی)

عدی ابنِ حاتم سے روایت ہے کہ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "اللہ تم میں سے ہر شخص سے ہم کلام ہو گا۔ اس حال میں کہ اللہ اور اس شخص کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہو گا۔ پھر وہ شخص اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو اُسے وہی نظر آئے گا جو اُس نے آگے بھیجا ہو گا۔ بائیں طرف دیکھے گا تو بھی وہی نظر آئے گا۔ آگے دیکھے گا تو کچھ نہیں سجھائی دے گا۔ سوائے اس آگ کے جو اس کے سامنے ہو گی۔ لہٰذا آگ سے بچو، اگرچہ ایک کھجور برابر صدقہ دے کر ہی کیوں نہ ہو" (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی میں سے ایک کھجور برابر صدقہ کرے، اور حلال کمائی ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بڑے احسن انداز سے قبول کرتا ہے، پھر اُسے صدقہ کرنے والے کے فائدے کے لیے پالتا رہتا ہے (بڑھاتا رہتا ہے) جیسے تم میں سے کوئی

اپنے بچھیرے کو پالتا ہے، حتیٰ کہ وہ (صدقہ) ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔" (بخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ "صدقہ گناہ کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو" (ابویعلیٰ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ "ایک درہم ایک لاکھ درہم سے بڑھ گیا" ایک شخص نے عرض کی "اے خدا کے رسُول! وہ کیسے؟" آپؐ نے فرمایا۔ "ایک نہایت مالدار شخص اپنے مال میں سے ایک لاکھ درہم لے اور صدقہ کر دے اور دوسرا شخص جس کے پاس کل دو درہم ہیں وہ اپنے مال میں سے ایک درہم صدقہ کر دے (تو قلیل المال شخص کا یہ ایک درہم کثیر المال شخص کے ایک لاکھ درہم سے اللہ کے نزدیک ثواب میں کہیں بڑھ کر ہوگا) (نسائی۔ ابنِ خزیمہ ابنِ حبان۔ حاکم۔)

عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ "قیامت کے روز ہر شخص اپنے صدقے کے سائے میں ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان جنّت و دوزخ کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ (احمد۔ ابنِ خزیمہ۔ ابن حبان۔ حاکم)

قارئینِ کرام ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ مذکورۂ بالا آیاتِ قرآنی اور حدیثِ نبوی مسلمانوں کی عملی زندگی کا دھارا بدلنے میں بالکل غیر مؤثر ہیں۔ نہیں بلکہ یہ تو انسان کے پاکیزہ ترین احساسات، شریفانہ جذبات، بہترین عزائم اور نیک اعمال میں دلچسپی کی تربیت و تدریب میں مشعلِ راہ اور قوّتِ دافعہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اپنی اس بات کی تائید میں ہم تاریخِ اسلام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

مفسّرین حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ "جب آیت مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ (ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے اور اللہ تعالیٰ اُسے بڑھا چڑھا کر عطا کرے) نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا "یا رسُول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرماتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا، "ہاں اُسے ابودحداح!" اُنھوں

نے کہا" یارسُول اللہ! اپنا ہاتھ دیجیے" پھر ہاتھ میں ہاتھ لے کر کہا"حضورؐ! میں نے اپنا باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیا" ابنِ مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ابودحداح کے باغ میں چھ سو کھجور کے درخت تھے اور اُن کے بیوی بچے بھی اُسی میں رہتے تھے۔ وہ اس وقت سیدھے باغ میں آئے اور آواز دی" اے دحداح کی ماں!" اس نے جواب دیا "لبیک" ابودحداح نے کہا" بچوں کو لے کر باغ سے نکل آؤ کیونکہ میں نے یہ باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیا ہے (یعنی راہِ خدا میں دے دیا ہے)

امام احمدؒ نے حضرت اُنس بن مالک سے روایت کی ہے کہ تمام انصار میں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مالدار تھے۔ وہ اپنے تمام مال اور جائیداد میں "بیرحاء" نامی باغ کو جو مسجد نبویؐ کے سامنے تھا سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی اکثر اس باغ میں جایا کرتے تھے اور اس کے کنوئیں کا عمدہ میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔ جب آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو ہر گز بھلائی نہ پاؤ گے) نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر آپؐ سے عرض کیا" یارسُول اللہ! خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو ہر گز بھلائی نہ پاؤ گے اور میرا سب سے زیادہ عزیز مال یہی بیرحاء نامی باغ ہے۔ لہٰذا میں اس کو اس اُمید میں کہ جو بھلائی خداوند تعالیٰ کے پاس ہے وہی میرے لیے جمع رہے خدا تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب اے اللہ کے رسُولؐ! آپ کو اختیار ہے جس طرح مناسب سمجھیں اس کو تقسیم کر دیں" آپؐ خوش ہو کر فرمانے لگے" واہ واہ یہ بہت ہی فائدہ مند مال ہے۔ اس سے لوگوں کو بہت ہی فائدہ ہوگا۔ پھر فرمایا" میری رائے یہ ہے کہ تم اس باغ کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ" بہت اچھا" اور پھر اسے اپنے رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

انفاق فی سبیل اللہ کا یہ سلسلہ ہر دور میں مختلف درجوں پر جاری رہا ہے اور لوگوں نے تاریخ کے ہر دور میں اس کے نہایت اعلیٰ و عمدہ نمونے دیکھے ہیں کہ مسلمان

کے نزدیک اللہ، اس کا رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم اور ان دونوں کی خوشنودی، اپنے خزانوں سونے چاندی اور دنیاوی زندگی کی ہر متاعِ گراں بہا سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔

امام لیث ؒ بن سعد کے بارے میں روایت ہے کہ اُن کی آمدنی تقریباً ہزار دینار فی یوم تھی، اس کے باوجود اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنے مال کو اتنی دیر اپنے پاس جمع رکھتے ہی نہیں تھے کہ اس پر سال گزُر جائے بلکہ جو بھی مال ان کے پاس آتا تھا وہ اُسے صدقہ کر دیتے تھے اور راہِ خدا میں خرچ کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امام لیث ؒ ہر روز تین سو ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے سے پہلے بات نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک عورت نے آپ سے کچھ شہد مانگا۔ آپ نے حکم دیا کہ اِسے ایک مشکیزہ شہد کا دے دو۔ آپ سے کہا گیا کہ وہ تو اس سے کم شہد پر بھی راضی ہو سکتی تھی۔ آپ نے جواب دیا: "اس نے اپنی ضرورت کے مطابق سوال کیا ہم نے اللہ تعالیٰ کے اُس انعام کے مطابق دیا جو اس نے ہم پر کر رکھا ہے۔"

اسی طرح عبداللہ بن جعفر کے متعلق کہتے ہیں کہ اُنھوں نے کسی حاجت مند سائل کو اپنے دروازے سے کبھی خالی ہاتھ نہیں موڑا تھا۔ اُن کے کسی ہم نشین نے یہ رویّہ اختیار کرنے پر اُنھیں بُرا بھلا کہا تو اُنھوں نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عادت ڈال دی اور مَیں نے اس کے بندوں کو ایک عادت ڈال دی۔ اُس نے مجھے اس بات کا خوگر بنایا کہ وہ مال و دولت دے اور مَیں نے اس کے بندوں کو اس بات کا عادی بنایا کہ میں انھیں مال دیتا رہوں۔ اب میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنی عادت کو چھوڑ دیا تو وہ بھی اپنی عادت کو چھوڑ دے گا۔"

خیراتی وقف صدقات میں سے اسلام نے جن چیزوں کی ترغیب دلائی ہے اُن میں سب سے اہم صدقۂ جاریہ ہے۔ دوسرے صدقات کی جزا و ثواب کی نسبت صدقۂ جاریہ کی جزا، امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ صدقۂ جاریہ کے اثر اور فائدے میں ایک قسم کا دوام اور ہمیشگی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا ثواب صدقہ کرنے والے کی موت کے بعد بھی اُس وقت تک اُسے پہنچتا رہتا ہے جب تک کہ لوگ اس سے فائدہ

اُٹھاتے رہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جب انسان کا رشتۂ حیات ٹوٹ جاتا ہے تو سوائے مندرجہ ذیل تین اعمال کے تمام اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں:

(۱) صدقۂ جاریہ (۲) نفع بخش علم (۳) دعائے خیر کرنے والا نیک بچّہ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں کچھ زمین ملی۔ آپ نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "اے اللہ کے رسُولؐ! میرا سب سے زیادہ عزیز اور بہتر مال وہ ہے جو خیبر میں میری زمین کا ایک حصّہ ہے (میں اس کو راہِ خدا میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں) فرمائیے کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا "اصل (زمین) کو اپنے قبضے میں رکھو اور اس کی پیداوار پھل وغیرہ خدا کی راہ میں وقف کردو" چنانچہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے فقراء، رشتہ داروں، قیدیوں، ناداروں اور مسافروں کے لیے اُس زمین کی پیداوار پھل وغیرہ اس شرط پر وقف کر دیئے کہ نہ تو اُن کو بیچا جائے، نہ ہبہ کیا جائے اور نہ حصّہ وراثت کے طور پر دیا جائے۔ البتہ جو شخص اس وقف کا نگران مقرر کیا جائے اُس کے لیے کوئی گناہ نہیں اگر وہ معروف طریقے سے اس میں سے کچھ لے کر کھالے اور اپنی جائیداد نہ بنائے۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو زمین کی پیداوار وغیرہ خدا کی راہ میں وقف کر دینے کا حکم دے کر رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خیراتی وقف کے لیے شرعی بنیاد مہیّا کر دی ہے جو ہر دور کے مسلم معاشرے میں کافی مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہے اور جو مسلمانوں کے دلوں میں بھلائی اور خلوص و خیر کے جذبات کو جاگزیں کرنے کی ایک روشن مثال اور واضح دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرے کی ضروریات میں سے کوئی ضرورت ایسی نہیں تھی جس کے لیے معاشرے کے اہلِ ثروت نے اپنی دولت کا کچھ حصّہ وقف نہ کر دیا ہو۔

یہ اوقاف اپنی وسعت اور تنوّع کے اعتبار سے بجا طور پر نظام اسلامی کے لیے باعثِ صد افتخار تھے۔ فقراء اور ناداروں کے لیے محتاج خانے قائم کر دیئے

گئے جو اُن کی خوراک اور لباس کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ خیراتی شفا خانے کھول دیئے گئے جو فقرا اور اہلِ حاجت کے لیے علاج معالجے اور دوا دارو کی سہولتیں مُہیّا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے لیے سفر وغیرہ کی سہولتیں بھی مہیّا کی گئیں۔

مسلمان اس تلاش میں رہتے تھے کہ معاشرے میں کون کون سی ضروریات ایسی ہیں جن پر خرچ کیا جائے، پھر وہ اُن کے لیے اپنے مالوں اور جائیدادوں کے کچھ حصّے وقف کر دیتے تھے، یہاں تک کہ اُنھوں نے بیمار جانوروں کے علاج اور گُم شدہ (بے آقا) کتّوں کی خوراک وغیرہ کے لیے اوقاف قائم کیے۔ جب بے زبان جانوروں کے بارے میں مسلمانوں کا یہ رحمدلانہ طرزِ عمل تھا تو پھر اس اشرف المخلوقات انسان کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ کیا ہو گا؟

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں اگر مسلم معاشرے میں یتیموں، شکستہ حال لوگوں، اندھوں، ناداروں اور دیگر مجبور اور آفت رسیدہ محتاجوں کے لیے اوقاف کا ایک نہایت وسیع نظام قائم ہو جائے۔

ہم یہاں مصر کے عہدِ ممالیک کی ایک تاریخی دستاویز کا متن پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، وہ دستاویز "قلادون" کے شفا خانے کا وقف نامہ ہے۔ وقف نامہ ایک سرکاری کاغذ ہوتا ہے جس پر وقف کرنے والا اپنے وقف سے متعلق ہر چیز تحریر کرتا ہے اور اس کی حدود مقرر کرتا ہے اور مسلمانوں میں سے کسی عادل اور نیک آدمی کو اُس پر گواہ بنایا جاتا ہے تاکہ جس شخص کی نگرانی میں وقف ہو وہ اُن حدود کا پورا التزام کرے۔ وقف کے نگران کو "ناظر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مذکورہ شفاخانے کے وقف نامے میں لکھا ہے:

"یہ شفاخانہ بیمار مسلمان مردوں اور عورتوں کے علاج معالجے کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ خواہ وہ خوشحال دولت مند ہوں یا فقیر محتاج۔ قاہرہ اور اس کے نواحی علاقوں میں رہتے ہوں یا باہر سے آئے

ہوئے ہوں، اپنی جنسوں اور بیماریوں اور امراض کے اختلاف کے باوصف وہ اس ہسپتال میں اکٹھے یا علیحدہ علیحدہ اور بڑھاپے اور جوانی کے عالم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ مریض مرد اور عورتیں جو فقیر اور محتاج ہونگے، اپنی کامل صحت یابی تک اپنے علاج کے لیے اس میں مقیم رہیں گے اور ہسپتال میں علاج وغیرہ کے لیے جو کچھ مہیا ہو گا وہ ہر اپنے اور پرائے اور مقامی اور مسافر پر غیر مشروط طور پر خرچ کیا جائے گا۔

اور ناظر اس وقف کی آمدنی سے مریضوں کی ہر ضرورت پر خرچ کرے گا۔ مثلاً بستر، لحاف اور گدّے وغیرہ۔ ہر مریض کے لیے اس کے مرض اور حالت کے مطابق چارپائی اور بچھونا مہیا کرے گا۔ تمام مریضوں کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ کے خوف اور اس کی اطاعت کو پیش نظر رکھے گا اور اُن کو اپنی رعایا سمجھتے ہوئے اُن کی بھلائی اور بہتری کے لیے پُورے خلوص سے جدوجہد کرے گا کیونکہ ہر راعی اپنی رعایا کے لیے پوچھا جائے گا۔

مریضوں کے لیے مُرغ، چوزے اور دیگر گوشت وغیرہ پکانے کا انتظام ہسپتال کا مطبخ کرے گا۔ ہر مریض کے لیے جو کچھ پکایا جائے گا وہ اس کے لیے ایک خاص کٹورے میں ڈھانپ کر رکھ دیا جائے گا۔ کوئی دوسرا مریض اس میں سے کچھ نہیں لے سکے گا۔ جب سب مریضوں کے لیے کھانا تیار ہو جائے گا تو ہر مریض کو اُس کا کھانا دے دیا جائے گا۔ رات دن کا جو کھانا ڈاکٹر صاحب اُن کے لیے تجویز کریں گے وہ انھیں پورا پورا دیا جائے گا۔

ناظر اس وقف کی آمدنی سے اُن مسلمان ڈاکٹروں کی تنخواہیں وغیرہ بھی دے گا جو اکٹھے یا باری باری سے مریضوں کی دیکھ بھال کا کام انجام دیں گے اور اُن سے اُن کے احوال (یعنی مرض میں افاقہ یا شدت،

وغیرہ پوچھیں گے اور کھانے پینے کی جو چیز بھی مریض کے لیے موزوں ہوگی وہ اُس کے نسخے میں لکھیں گے اور اجتماعی طور پر یا باری باری سے ہر روز رات کو ہسپتال میں رہیں گے اور مریضوں کا علاج اور دیکھ بھال کریں گے۔

اگر کوئی شخص اپنے گھر میں بیمار ہو اور محتاج ہو تو ناظرِ شفاخانہ ہذا اُسے شربت، ادویہ اور معجونین وغیرہ جن کی اُسے ضرورت ہو، مہیّا کر سکتا ہے اور اسے اس معاملے میں خرچ کرتے وقت کنجوسی سے کام نہیں لینا ہوگا۔[۱]

یہ تاریخی دستاویز اُس دَور کی ہے جسے مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے سنہرے اَدوار کے مقابلے میں پستی اور پسپائی کا دَور سمجھا جاتا ہے۔

---

[۱] منقول از لبس من الاسلام مؤلفہ محمد الغزالی ص ۲۱، ۲۵

حُجّیّت حدّیث

قرآن مجید اور حدیث شریعت اسلامی کے دو بڑے مآخذ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی آیاتِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے، اس لیے منشائے ربانی کے عملی مضمرات کو سمجھنے کے لیے حدیث کا جاننا ازبس ضروری ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم نے آیات قرآنی کی روشنی میں احادیث نبویؐ کی اہمیّت کو واضح کیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نبی کا کلام دین میں حجت ہے کیونکہ وہ کوئی بات بھی اپنی خواہش سے نہیں کرتا بلکہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے وحی الٰہی کے تحت کہتا ہے۔

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم نے اپنی زندگی دینِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ انھوں نے قرآن مجید، صحیح مسلم، اور مشکوٰۃ شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ "سیرتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم" اور "اسلام میں نبوت" ایسی بلند پایہ کتب تحریر فرمائیں جو کہ تشنگانِ علم کے لیے مشعل راہ ہیں۔ زیرِ نظر مضمون مرحوم کے علم حدیث کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

قرآن مجید اگر شریعتِ اسلامی کی رُوح ہے تو حدیث اس کا جسم۔ حدیث ہی سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا وہ نقشہ اُبھر کر سامنے آتا ہے جس کا اسلام علمبردار ہے۔ اگر قرآن مجید کے ساتھ حدیث محفوظ نہ ہوتی تو ہمارے لیے منشاءِ ربانی کے عملی مضمرات جاننا بالکل ناممکن تھا۔

باری تعالیٰ اپنے پیغام کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو جو ذریعہ بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ان مقدس حضرات کی زندگیوں میں پیغامِ ربانی کا عکس اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور اس حقیقت کو جان سکیں کہ منشائے الٰہی کو پورا کرنے کی عملی صورت کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ (التوبہ۔ ۳۳)

اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پورے جنسِ دین پر غالب کر دے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہدایتِ الٰہی کا سرچشمہ باری تعالیٰ کا رسول ہے اور یہی وہ سب سے زیادہ مستند اور قابلِ اعتماد ذریعہ ہے جس سے ہمیں صحیح علم اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۂ مریم میں مذکور ہے:

یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۔ (مریم ۔ ۴۳)

ابّا جان! درحقیقت میرے پاس وہ حقیقی علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ پر چلاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا یہ ارشاد اس حقیقت کی واضح ترجمانی کرتا ہے کہ ہدایتِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ پیغمبر ہی کی ذات ہے۔ اسی کی وساطت سے تعلیماتِ الٰہی ہم تک پہنچتی ہیں اور پھر اس کی حیاتِ طیبہ ان تعلیمات کا مظہر بنتی ہے اور اُس کی پیروی سے ہی منشائے الٰہی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بڑے واضح الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ محض "العلم" کا حاصل ہو جانا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبر علیہ السّلام کی پیروی کر کے اس علمِ ربانی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ حقیقت کو پانے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ رسول کو چونکہ باری تعالیٰ اپنے منشا

کا ترجمان بنانا ہے اس لیے اس کی اطاعت درحقیقت خداوند قدوس کی اطاعت ہی ہوتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۔ ۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح ہے کہ نبی کی پیروی ہی واحد ذریعۂ نجات ہے۔ مثلاً سورۂ نور میں یہ ارشاد ہے وان تطیعو اتھتدوا (یعنی اگر تم رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے) پھر سورۂ حشر میں مذکور ہے:

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ ○

رسولؐ جو تم کو دیں اُس کو لے لو اور جس سے منع کریں اُس سے رُک جاؤ اور اس بارے میں اللہ (کی پکڑ) سے ڈرو۔ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جہاں ایک طرف رسولؐ کی پیروی ذریعہ نجات ہے تو دوسری طرف رسولؐ کی نافرمانی سے انسان ضلالت و گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ ○ (الاحزاب۔ ۳۶)

اور جو کوئی بھی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے وہ بڑی کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

اسی سلسلے میں قرآن مجید نے اس امر کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اسلام میں اللہ کی محبت کا مطلب وہ نہیں جو کہ دنیا کی بعض مذہب پرست قوموں میں پایا جاتا ہے کہ انسان کسی مافوق الفطرت ہستی کی محبت میں گم ہو کر اپنی انسانی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر دے۔ اسلام نے اللہ کی محبت کے طلبگار کو یہ بتایا ہے کہ وہ ذاتِ مطلق اگر اُسے فی الحقیقت محبوب ہے اور وہ اُس

کی رضاجوئی کے لیے دل سے خواہش مند ہے تو اُس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اس بزرگ و برتر ذات کی صدقِ دل کے ساتھ اطاعت و پیروی کرے جو اُس کی طرف سے انسانوں کو خدا کی محبت کی راہ دکھانے اور پھر خود اس راہ پر چل کر اس کی عملی صورت سمجھانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آلِ عمران۔ ۳۱)

کہیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ کی خود پوری طرح نگرانی کر کے اس انداز پر اُسے ڈھالا ہے کہ وہ ایمان باللہ، محبّت اور خوفِ الٰہی، نیکی اور پرہیزگاری، شرافت اور امانت، حکومت اور سیاست الغرض زندگی کے ہر معاملے میں ایک کامل و اکمل نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ باری تعالیٰ نے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو مسلمانوں کے لیے بطورِ مثال پیش کیا ہے اور اس امر کی تاکید کی ہے کہ زندگی کے جس معاملے میں اُنھیں رضائے الٰہی کے عملی تقاضوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہو اور یہ معلوم کرنا مقصود ہو کہ اللہ پر ایمان کس پاکیزہ زندگی کا طالب ہے تو اُنھیں حضور سرورِ کائنات کی مقدّس زندگی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (الاحزاب۔ ۲۱)

تحقیق تمھارے پاس اللہ کے رسول (کی زندگی میں) اُسوۂ حسنہ ہے، اس کے لیے جو ڈرتا ہو اللہ اور روزِ آخرت سے۔

حضور سرورِ کائنات کی زندگی صرف ایک پہلو ہی میں نمونہ نہیں بلکہ ہر لحاظ سے نمونہ ہے۔ انسان اور خدا کے ساتھ تعلقات میں، انسان اور انسان کے تعلقات میں اور انسان اور کائنات کے ساتھ تعلقات میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ

ہی حق اور صداقت کا واحد معیار ہے، اس ایک معیار کے سوا باری تعالیٰ کو کوئی دوسرا معیار قبول نہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مقدس زندگی کو ہمارے لیے اس بنا پر بھی اُسوہ بنایا گیا ہے کہ اللہ کا نبی جو کچھ کہتا ہے یا جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ اُس کی زبان فیض ترجمان حق تعالیٰ کے ارشادات کی شارح ہوتی ہے اور اس کا عمل آیاتِ الٰہی کی، اُسی کے حکم کے مطابق عملی تفسیر ہوتا ہے۔

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔

اور وہ نہیں بولتا اپنی خواہش سے مگر وہی کچھ جو کہ وحی بھیجی جاتی ہے اس پر۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق صرف قرآن مجید ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اس آیت کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے تو اس حقیقت کا واضح پتہ چلتا ہے کہ وحی کے ذریعہ صرف قرآن مجید ہی نہیں اُتارا گیا بلکہ دوسرے احکام بھی حضورؐ سرورِ دو عالم کو وحی کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں اور دوسرے معاملات میں بھی باری تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے رسول کی رہنمائی فرمائی ہے۔ فرشتے کے نزول کے بیان کے بعد قرآن مجید نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس موقع پر جو کچھ دیکھا اور سنا وہ سراسر حق تھا اور اس کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ اُسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی سے اس بات کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس موقع پر حضورؐ سرورِ کائنات کو وحی کے ذریعے بعض باتوں کا علم ہوا جن کی تفصیل قرآن مجید سے نہیں بلکہ احادیث نبوی ہی سے ملتی ہے۔ اس آیت سے یہ بات پُوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کا کلام دین میں حجت ہے کیونکہ وہ کوئی بات بھی خواہش سے نہیں کہتا بلکہ وحی الٰہی کے تحت کہتا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ (النور۔ ۶۳)

تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔

اور ایک دوسرے مقام پر حکم دیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ (الحجرات: ۲۱)

اے ایمان والو تم اللہ اور اس کے رسول سے کسی کام میں سبقت مت کیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ اُن سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہو۔ کہیں تمھارے اعمال برباد نہ ہو جائیں۔

مسلمانوں کو پہلی بات یہ ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل میں مبادرت نہ کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ صحیح، مستند بات وہی ہے جو حضورؐ کی طرف سے منقول ہو کیونکہ حضورؐ وحی الٰہی کے ترجمان ہیں، اس لیے سب سے پہلے یہ دیکھو کہ اللہ کے رسولؐ کسی معاملے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور اس کے بعد اُس کے مطابق عمل کرو۔ اپنی بات کو اُن کے مقابلے میں بالا کرنے کی کوشش نہ کرو۔

امام ابن قیمؒ نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "اگر محض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بالا کرنے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں تو اُن لوگوں کے اعمال کا ضیاع یقینی ہے جو اپنی فکر اپنے فہم و تدبر اور اپنی آراء کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال پر فوقیت

دیتے ہیں[1]" فوقیت صرف یہی نہیں کہ آدمی زبان سے یہ کہے کہ اُس کی رائے حضورؐ کی رائے سے بالاتر ہے بلکہ فوقیت یہ ہے کہ حضورؐ کے اقوال وافعال کو نظر انداز کر کے کوئی طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ حضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ سے بے نیازی کسی مومن کی شان نہیں بلکہ کافرانہ جسارت ہے۔

ظاہر بات ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اقدس کے بارے میں یہ تنبیہات صرف قرآن مجید کے معاملے تک تو محدود نہیں کہ جب حضورؐ سرورِ دو عالم قرآن مجید کے الفاظ زبان مبارک سے ادا کر رہے ہوں تو تم ان باتوں کا خاص خیال رکھو۔ یہ تنبیہات حضورؐ کے ہر فعل اور ہر لفظ کے بارے میں ہیں۔ حضورؐ کی کسی امر کے بارے میں صراحت سے پہلے اپنی طرف سے کسی مومن کو پیش قدمی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ منشائے خداوندی کو حضورؐ کی وساطت کے بغیر نہیں جانا جا سکتا۔ اسی طرح صوت النبی میں حضورؐ سرورِ دو عالم کے حلق سے نکلی ہوئی ہر آواز شامل ہے خواہ وہ قرآن کے الفاظ ہوں یا حضورؐ سرورِ کائنات کے اپنے ارشادات کیونکہ حضورؐ کی ہر بات اور ان کا ہر عمل خداوند تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَ هُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (سورۃ الاعراف : ۲۰۳)

آپ کہہ دیجیے کہ مَیں تو بس اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو کچھ میرے اوپر میرے پروردگار کی طرف سے وحی ہُوا ہے اور یہ (خود بہت سی) دلیلیں ہیں تمھارے پروردگار کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی پُوری زندگی وحیٔ الٰہی

---

[1] اعلام الموقعین، جلد اوّل، ص ۵۱

کے مطابق بسر ہوئی اور حضورؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا یا کیا وہ سب وحی الٰہی کے اشارے پر تھا۔ کیا کوئی صاحبِ عقل اس بات کو باور کر سکتا ہے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری سرگرمیاں صرف قرآن مجید سنانے اور اس کے اندر مندرج احکام کی پیروی کرنے میں بسر کیں۔ خود کلام الٰہی میں بعض ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بعض احکام صرف حضور سرورِ کائنات نے دیے جن کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود نہیں۔ میں یہاں صرف دو امور کا ذکر کرتا ہوں۔ سورۂ توبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع فرمایا گیا ہے،

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ۔ ۸۴)

اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اُس پر کبھی بھی نماز جنازہ نہ پڑھیے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے نماز جنازہ شروع ہو چکی تھی اور مسلم معاشرے سے تعلق رکھنے والے جو لوگ فوت ہو جاتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی نماز جنازہ پڑھایا کرتے تھے، حالانکہ قرآن میں نازل ہونے والی کوئی آیت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس میں حضورؐ اور مسلمانوں کو نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز جنازہ حضورؐ کے حکم سے شروع ہوئی۔

اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیت وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا (۲) میں ایک حکایت اور شکایت کے ضمن میں جمعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ جمعہ حضورؐ کے حکم کے مطابق اس آیت کے نزول سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور مسلمان اسے حضورؐ کے حکم ہی سے ادا کر رہے تھے۔ یہاں نمازِ جمعہ کے آغاز کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ایک شرعی حکم اور دینی عمل جو حضورؐ کے فرمان سے شروع ہو چکا ہے اُس کے بارے میں بعض افراد کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی۔ قرآن مجید سے اس قسم کی

ایک نہیں بلکہ متعدد مثالیں ایسی پیش کی جا سکتی ہیں جن سے اس بات کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے احکام اور آپ کے اعمال ہی سے شریعت کا نظام تشکیل پا رہا تھا اور لوگ ان احکام و اعمال کو دین میں اُسی طرح حجت مانتے تھے جس طرح کہ احکام ربانی کو، بلکہ احکام ربانی کو صحیح طور پر سمجھنے اور انھیں ٹھیک انداز سے بجالانے کے لیے وہ حضورؐ سرورِ دوعالم کی طرف رجوع کرتے تاکہ وہ انھیں ان احکام کی صحیح نوعیت اور صورت بتائیں۔ مثلاً قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کا تاکیدی حکم نازل ہوا اور اس کے ارکان اور بعض اجزائے ترکیبی مثلاً قیام، رکوع، سجود، قرأت وغیرہ کا ذکر بھی کتاب الٰہی میں موجود ہے مگر ان اجزاء کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ ادا کرنے کا بیان اور نماز کی پوری ترکیب اس میں مذکور نہیں۔ صرف اقیموا الصلوٰۃ سے تو کوئی واضح چیز سامنے نہیں آتی۔ اگر اسے محض لغت کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اَلصّلی کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں۔ چنانچہ صَلِیَ بَالنّاد کے معنی ہیں اُس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ پھر اس کے معنی دعا دینے کے بھی ہیں۔ عربی کا محاورہ ہے صَلَّیْتُ عَلَیْہِ، امام رازی نے اس کے معنی کیے ہیں ای دعوت لہ، یعنی میں نے اس کے لیے دُعا کی۔ پھر قرآن میں فرشتوں کے متعلق مذکور ہے کہ وہ اللہ کے رسولؐ پر صلوٰۃ پڑھتے ہیں۔ صلوٰۃ کے ان مختلف لغوی معنوں کو اگر نگاہ میں رکھ کر اسلام کے اس سب سے اہم فرض کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کوئی بات بھی واضح نہیں ہوتی۔ احادیث نبوی کو اگر درمیان سے نکال دیا جائے تو ایک شخص بجا طور پر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اگر وہ آگ تاپ لے تو اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص محض زبان سے چند دعائیہ کلمات ادا کر کے اقامتِ صلوٰۃ کے فرض سے سبکدوش ہونے کا دعویدار ہو سکتا ہے۔

نماز کی، جو صورت اس وقت موجود ہے اور جس پر تواتر کے ساتھ ساڑھے تیرہ سو سال سے کروڑوں مسلمان عمل پیرا ہیں وہ حضورؐ کی وساطت ہی سے ہم تک پہنچی ہے۔ حضورؐ سرورِ دو عالم نے اقامت الصلوٰۃ کے فرض کی خود نماز قائم کر کے صراحت فرمائی اور حکم دیا، صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِىْ أُصَلِّىْ۔ یعنی تم جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو، اس طرح نماز پڑھو۔ اور اُمت نے حضورؐ سرورِ دو عالم کے عمل ہی سے نماز کی صحیح ترتیب اور اس کے اجزاء کی ترکیب معلوم کی۔ اگر حضورؐ اس معاملے میں ہماری رہنمائی نہ فرماتے تو ہمارے سامنے صلوٰۃ کی کوئی واضح اور متعیّن صورت سامنے نہ آتی اور ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق لفظ صلوٰۃ کی تشریح کر کے عمل کرتا چلا جاتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے احادیث نبوی سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن سے نماز کی ترتیب اور اس کا طریقہ جاننے کی کوشش کی ہے وہ آج تک نماز کی کوئی ایسی ہیئت سامنے نہیں لا سکے جس پر سب کا اتفاق ہو۔ یہی حال حج، زکوٰۃ، صوم اور جہاد کا ہے۔ حج کے لغوی معنی کسی کے دیکھنے کا قصد کرتے کے ہیں۔ خود قرآن مجید میں حج کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں صرف حج البیت کا ذکر ہے جس سے اگر زیادہ سے زیادہ سمجھا جا سکتا ہے تو یہی کہ بیت اللہ کے قصد کا حکم دیا جا رہا ہے لیکن اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے خاص ایام میں عرفہ میں جانا خاص مدّت تک قیام کرنا اور دوسرے مناسک، یہ سب باتیں ہمیں احادیث نبوی ہی سے ملتی ہیں۔ حضورؐ نے یہ ساری باتیں اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت سے تو نہیں فرمائیں بلکہ اُن سب کی وضاحت اُن کے فریضۂ نبوت میں شامل تھی، چنانچہ قرآن پاک نبیؐ کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل۔ ۴۴)

اور نازل کیا ہم نے آپ کے ہاں ذکر (کتاب) تاکہ آپ کھول کھول

کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اُس چیز کو جو نازل کی گئی اُن کی طرف اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

یہ آیت اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ رسُول کا کام معاذاللہ محض ہرکارے کا نہیں کہ وہ صرف کتابِ الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دے بلکہ اس عظیم کتاب کی تشریح بھی اُس کے فریضۂ نبوت میں داخل ہے اور رسُول یہ کام باری تعالیٰ کے حکم کے مطابق اُسی کی راہنمائی میں سرانجام دیتا ہے۔ اس "تبیّن" کی کئی صورتیں ہیں۔

(ا) باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن اُمور کو مجمل بیان کیا ہے رسُول ان کی صراحت فرمائیں۔

(ب) اپنے عمل سے اُن کی وضاحت کریں۔

(ج) جن امور میں اختلاف ہو اُن کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرما کر اُنھیں حتمی طور پر طے کر دیں۔

(د) صحیح اور غلط راستوں کی پوری طرح نشاندہی کر دیں تاکہ سلامتی کے راستے پر چلنے والے اپنے آپ کو گمراہی سے بالکل محفوظ رکھ سکیں۔

قرآن مجید میں لفظ تبیّن کے یہ سارے مفہوم ملتے ہیں۔ مثلاً مخفی اور مضمر چیز کی وضاحت کے لیے قرآن مجید کی یہ آیات بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں:

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ (ابراہیم۔ ۴۵)

اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا تھا۔

وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ (الزخرف۔ ۶۳)

نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو اُن کی وضاحت کر دوں۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ۔ ۲۵۶)

ہدایت صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو جائے گی۔

یہ چند آیات محض مثال کے طور پر درج کی گئی ہیں۔ قرآن مجید کی بے شمار

آیات "تبییّن" کے ان مختلف پہلوؤں کی طرف نہایت واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں۔

قرآن مجید کے مجمل احکام کی حضورؐ نے وضاحت فرمائی اور اُن کے ارشادات سے ہی ہمیں ان کے صحیح مفہوم کا علم ہوگا۔ مثلاً سورہ الانعام میں خداوند تعالیٰ نے مختلف اثمار کے باغات کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتنا ہی ارشاد فرمایا:۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (آیت ۱۴۲)

اور فصل کاٹنے کے دن اُن کا حق ادا کرو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فصل کے کاٹنے کے دن ان کا حق ادا کرنے کے حکم سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ باری تعالیٰ کا منشاء کیا ہے۔ اس ضمن میں اگر احکام رسولؐ سامنے نہ ہوں تو ایک نہیں بلکہ کئی مطالب نکالے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جن لوگوں نے ان پھلوں کی کاشت میں محنت مزدوری کی ہے اُنھیں اُجرت دو، یا ان میں سے زمین کے مالکان کو اُن کا حصّہ دو یا اُنھیں خوب سنبھال کر رکھو اور اُنھیں ضائع نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس موقع پر سنت ہی سے ہمیں یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ یہاں پیداوار زمین سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ پھر اس کی شرح بھی ہمیں احادیث نبوی ہی سے معلوم ہوتی ہے اور یہاں لفظ مُسرِفین کے محل استعمال کا بھی صحیح پتہ کتب احادیث سے چلتا ہے۔

اسی "تبییّن" کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر اس بات کی بھی ذمّہ داری عائد فرمائی ہے کہ وہ عمومی احکام کی صحیح نوعیت متعیّن کر کے ان کی مستثنیات بیان کر دیں۔ مثلاً قرآن مجید میں چور کی سزا یہ ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَاءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (المائدہ ۔ ۳۸)

اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ

کاٹ ڈالو۔ اُن کے کرتوتوں کے عوض اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور عبرتناک سزا کے۔

السارق اور السارقہ کے جرم کا فیصلہ کرنے میں ہمیں کئی ایک دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مثلاً اسلامی شریعت کی رو سے چوری کی تعریف کیا ہے اور کیا ہر چور کے ہاتھ کاٹ دینے چاہئیں خواہ اس کے جُرم کی نوعیت کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ کیا جو شخص ذہنی طور پر مفلوج ہے اُس سے بھی اگر اس جرم کا ارتکاب ہو جائے تو وہ بھی قطعِ ید کی سزا کا مستوجب ہے؟ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ کیا ایک شخص فی الواقع چور ہے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات چوری کے سلسلے میں ذہن میں آتے ہیں جن کا قرآن مجید کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس اجمال کی تفصیل ہمیں صرف سنتِ نبویؐ سے ملتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں بتایا ہے کہ سرقہ کا اطلاق خیانت پر نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لے۔ چنانچہ جو مال حفاظت میں نہیں اس کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا بھی نہیں دی جا سکتی۔ پھل، ترکاری، کھانے پینے کی چیزوں اور حقیر اشیاء کی چوری بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ یہ سب تفصیلات ہمیں نبی اکرمؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حاصل ہوئی ہیں اور تبیینؐ کے ذیل میں آتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ حضورؐ نے ان اُمور کا فیصلہ اپنی ذاتی رائے سے فرمایا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس باطل خیال کی واضح طور پر تردید کی ہے:

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ۔ (سورۃ النساء : ۱۶۵)

اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ

آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ اسی کے مطابق کریں جو اللہ نے آپ کو سمجھا دیا ہے۔

یعنی اس کتاب کے ساتھ پیغمبر علیہ السّلام نے جو فیصلے فرمائے ہیں اُن کی نوعیت عام اجتہاد کی نہیں بلکہ احکامِ خداوندی کی ہے۔ کیونکہ اِن سب میں قادر مطلق نے سرورِ کائناتؐ کی براہِ راست رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ یہ سارے فیصلے بھی درحقیقت اسی ذاتِ برحق ہی کے ہیں جس نے قرآن نازل فرمایا ہے۔ ان فیصلوں سے انحراف ایک ایسا باغیانہ طرزِ عمل ہے جس سے ایمان اکارت ہوجاتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء۔۶۵)

اے محمدؐ! تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سرِ تسلیم خم کردیں۔

اس آیت سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلینا ایمان کی بنیادی شرط ہے کیونکہ یہ محض کسی دانشور یا قاضی کے فیصلے نہیں جن سے اختلاف کیا جاسکتا ہو، یا ان کے خلاف اپیل کے دروازے کھلے ہوئے ہوں بلکہ ترجمانِ وحی کے فیصلے ہونے کی بنا پر اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح کہ خود باری تعالیٰ کے فیصلے۔ ان کے درمیان اگر فرق ہے تو یہی کہ کچھ فیصلے اُس نے خود اپنی زبان سے فرمائے ہیں اور بعض اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے صادر کروائے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ (الاحزاب۔۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا فیصلہ صادر کردیں تو اُنھیں کوئی اختیار باقی رہے۔

یہاں اللہ اور رسولؐ دونوں کے فیصلوں کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے اور اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ ایک مومن کا کام ان دونوں کے فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا ہے۔ قرآن مجید نے اپنے معجزانہ اندازِ بیان سے اُس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو بعض ذہنوں میں پیدا ہو سکتی ہے کہ رسولؐ کے فیصلوں سے مراد صرف اُن نزاعی امور کے فیصلے ہیں جو دو فریق حضورؐ کے پاس تصفیہ کے لیے لاتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت میں امر کو بطور نکرہ استعمال کر کے قرآن مجید نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ حضورؐ کو صرف جھگڑے چکانے کے لیے ہی حَکَم مقرر نہیں کیا گیا بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں حضور سرورِ دو عالمؐ کا ارشاد دین میں فیصلہ کُن اہمیت رکھتا ہے اور اس سے پہلو تہی ایمان کو غارت کر دیتی ہے۔ حضورؐ کے یہ فیصلے صرف ایک شعبۂ زندگی یا متنازع فیہ معاملات تک ہی محدود نہیں بلکہ پُوری زندگی پر حاوی ہیں اور ان سب کو دل و جان سے تسلیم کرنے ہی سے ایمان کا بنیادی تقاضا پُورا ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کی تعلیم و تفہیم، اُس کے مضمرات کی وضاحت اور پھر کلام الٰہی کے مطابق لوگوں کا تزکیۂ نفس در تبیّن'' ہی کے مختلف گوشے ہیں۔ جس قادرِ مطلق نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے قرآن نازل فرمایا اس نے اس بات کا بھی خاص طور پر اہتمام کیا کہ لوگ اس کی تلاوت کے صحیح انداز، اس کی گہری حکمتوں اور اس کی حیات آفریں تعلیمات کو بھی اُسی رسُولؐ کی زبان سے سُنیں اور سمجھیں جس کی وساطت سے نوعِ بشری کو اللہ تعالیٰ کا یہ بیش قیمت عطیہ ملا ہے۔ قادرِ مطلق اور لامحدود ذات کے کلام کو محدود فکر و نظر رکھنے والا انسان آخر اپنی معمولی سی عقل کے ساتھ کیونکر اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ نے نوعِ انسانی پر رحم کرتے ہوئے اس بات کا التزام کیا کہ انسانوں میں اپنی حکمتِ بالغہ کے مطابق بعض مقدس ہستیوں کا انتخاب کیا جائے اور انھیں نبوت سے سرفراز فرما کر کلامِ الٰہی کی تعلیم کی ذمہ داری سونپی جائے۔ اگر محض عقلِ انسانی خود اپنے برتنے پر کلامِ

ربانی کو سمجھنے پر قادر ہوتی تو پھر رسول کی ضرورت قطعاً پیش نہ آتی۔ کیا اُس بزرگ و برتر ذات کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے کلام کے کروڑوں نسخے فرشتوں کی مدد سے نوعِ انسانی میں تقسیم کر دیتی یا پھر فضا کو اس بات پر مامور کر دیتی کہ وہ ہر وقت اس پیغام کو نشر کرتی رہے۔ اپنے پیغام پہنچانے کے لئے بعض انسانوں کا انتخاب صرف اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ انسان کے ذریعہ ہی انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کو اچھّی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن مقدس ہستیوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی وہ پوری انسانیت میں اگرچہ فہم و احساس کے اعتبار سے بھی افضل ہیں مگر اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی براہِ راست نگرانی فرماتا ہے اور رسالت کے کام میں ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کرتا ہے چنانچہ جس قادرِ مطلق نے اُنھیں اپنا کلام انسانوں تک پہنچانے کے لیے دیا ہے اُسی ذاتِ برحق نے انھیں اس کلام کا صحیح فہم بھی عطا فرمایا ہے اور اس کے مختلف گوشوں کو اس کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ ایک نبی اور غیر نبی کے شعور و ادراک میں یہی بنیادی فرق ہے۔ پیغمبر جو کچھ حاصل کرتا ہے خدا سے حاصل کرتا ہے یا اس کے مشاہدات اور تجربات کی باری تعالیٰ کے دربار سے واضح طور پر تائید یا تصحیح ہو جاتی ہے اور پھر پیغمبر کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے کام کو پسند فرمایا ہے۔ پیغمبر کے علاوہ دوسرے جتنے انسان ہیں اُنھیں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں کوئی ایسا یقینی علم حاصل نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر وہ پُورے وثوق سے یہ کہہ سکیں کہ اُسے اللہ کے ہاں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السّلام کے طرزِ عمل کی کس طرح خود نگرانی فرماتے ہیں اور کس طرح ہر قدم پر اُنھیں زندگی کے ہر معاملے میں ہدایت دیتے ہیں اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک نابینا صحابی آئے اور آپؐ نے مصالح کے تحت سردارانِ قریش سے اپنے آپ کو

مصروف رکھا اور اُن کی طرف توجہ نہ دی تو باری تعالیٰ نے فوراً حضورؐ کے طرزِ عمل پر گرفت کی اور انھیں بتایا کہ ان کا رویہ خدا کو کھٹکا ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى (عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس پر کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا اور پاک ہوتا۔

اسی سلسلے میں مسجد ضرار کا واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضورؐ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام سے منع کر دیا گیا۔

لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيهِ

تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا، جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔

اسی نوعیت کے کئی ایک واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں جو اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ نبی جو کام بھی کرتا ہے خدا کی ہدایت اور اُس کی واضح نگرانی میں کرتا ہے۔ کیا کسی غیر نبی کے طرزِ عمل کی بھی اس نہج پر نگرانی ہوئی ہے؟ اگر باری تعالیٰ ان چھوٹے چھوٹے امور پر اپنے پیغمبر کو ہدایت کرتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رسالت کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا کام اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے محض فہم و تدبر پر چھوڑ دیا ہو اور اُسے اس امر کا اختیار دیا ہو کہ وہ تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی عقل سے فیصلے کرتا رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کو عقل و فہم سے معاذ اللہ محروم رکھا جاتا ہے بلکہ میری اس گزارش کا مطلب صرف یہ ہے کہ نبی کی عقل کی باری تعالیٰ خود حفاظت کرتا ہے اور اس

بات کا اہتمام کرتا ہے کہ وہ جو فیصلے بھی کرے وہ خدا کی منشا کے عین مطابق ہوں اور نبی کو اس بات کا واضح طور پر شعور ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے فیصلوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کہا گیا ہے اور نبی کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1]

اگر اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات خود بخود نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض بھی اپنے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیے ہیں اور آپؐ نے اُنھیں جس طرح سے سرانجام دیا ہے ان سب میں خدا کی رضا اور اس کی نگہداشت اور اس کی رہنمائی اوّل سے آخر تک اس انداز میں شامل رہی ہے کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے سارے اقوال اور حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کے سارے اعمال درحقیقت کلامِ الٰہی کی الہامی تفسیریں ہیں۔ اس بنا پر کسی فرد یا گروہ یا ادارے کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان کے اندر کوئی تغیر و تبدّل کرے۔ حضورؐ نے اپنے فرض کی ادائیگی میں جو کچھ کیا وہ سب خدا کی طرف سے کیا اور اس بنا پر حضورؐ کے احکام کی پابندی ایک مسلمان کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ احکامِ الٰہی کی پابندی۔ ہم تک تو کلامِ الٰہی اُسی مقدّس ذات کے ذریعے سے پہنچا ہے اور اُسی کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس کی تشریح و توضیح کے لیے جو ارشاد فرمائے وہی خدا کی نظر میں سب سے زیادہ مستند اور صحیح ہے کیونکہ اس کی وضاحت کا کام بھی خداوند قدوس نے اس مقدّس ہستی کے سپرد کیا ہے اور یہ باری تعالیٰ کا انسانیت پر عظیم احسان ہے کہ اپنے کلام کی تشریح بھی اُس نے خود ہی اپنے نبی کے ذریعہ فرما دی۔

---

[1] اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح - ۱۰)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (آل عمران - ۱۷)

یقیناً احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب کہ بھیجا اُن میں ایک رسُول انھی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے اُن پر اُس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے اُن کو اور تعلیم دیتا ہے اُن کو کتاب وحکمت کی اور وہ اس سے پہلے واضح طور پر گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے بڑے واضح الفاظ میں اُن مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے جن کے لیے حضورؐ سرور کائنات کو مبعوث فرمایا گیا۔ پہلی چیز یعنی تلاوتِ آیات کا مطلب تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں جو کتاب اُن پر نازل فرمائی اس کی تلاوت کرنا۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم کا کام محض کتاب الٰہی کے مربوط ومرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا ہی ہے تو پھر تعلیمِ کتاب کا ذکر کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں تعلیم کتاب کا مطلب آیات کی تشریح اس کے معانی ومطالب کی وضاحت اور کتاب اللہ کے احکام کی صراحت ہے اور یہ سب فرائض رسالت میں اُسی طرح داخل ہیں جس طرح کہ قرآن مجید کے کلمات کی تلاوت و تبلیغ۔ اب اگر متنِ قرآن دین میں حجت ہے تو وہ وضاحت اور صراحت بھی دین میں حجت ماننا پڑتی ہے جو تعلیمِ کتاب کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے ارشاد فرمائی ہے کیونکہ حضورؐ کو یہ فرض بھی تلاوتِ آیات کی طرح بطور رسُول سونپا گیا ہے۔ یہ کام حضور سرور دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی ذاتی یا شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ باری تعالیٰ کے حکم کے مطابق رسالت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے کیا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے قرآن کے جن الفاظ کو تلاوت فرمایا ہے وہ تو دین میں حجّت

ہوں مگر اُنھوں نے الفاظ کے جو معانی بیان فرمائے ہیں یا جو مطالب متعیّن کیے ہیں یا احکامِ الٰہی کی جن حکمتوں کا ذکر کیا ہے ان کی حیثیت محض تاریخی ریکارڈ کی ہو۔ قرآن مجید اس بات کی پُر زور تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی جس طرح تلاوت کے معاملے میں اتباع لازمی ہے۔ بالکل اسی طرح تعلیم کتاب کے سلسلے میں بھی اُن کے ارشادت کی اطاعت اور فرمانبرداری بھی انتہائی ضروری ہے۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (حشر-۱)

جو تم کو رسُول دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ۔

قرآن مجید میں جا بجا اللہ کی اطاعت اور رسُول کی اطاعت کو مستقل جملوں کی صورت میں ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے اس سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کی طرح اہلِ ایمان پر رسُول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے کیونکہ اُن کے ذریعہ ہمیں دین کے معاملے میں جو کچھ ملا ہے وہی خدا کے نزدیک صحیح اور مستند ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(النور-۵۱)

مومنوں کا قول تو یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ اور اُس کے رسُول کی طرف اُنھیں بلایا جائے تاکہ رسُول اُن کے درمیان حُکم کرے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

اس آیت میں بھی دو مستقل تابعداریوں کا ذکر آیا ہے اور پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ حکم کا صیغہ واحد ہے جس سے مراد آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی پابندی ہم پر فرض ہے مگر دنیا میں ان احکام کی توضیح اور ان کی تعیین کے لیے ہمیں

حضور سرورِ کائنات کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور وہاں سے جو فیصلہ صادر ہوگا وہی ان احکام کا صحیح منشاء قرار دیا جائے گا۔ پھر یہاں فعل مضارع استعمال کیا گیا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مستقل مُطاع ہونے پہ صاف طور پہ دلالت کرتا ہے۔ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت حضورؐ سرور دو عالم کی اس حیثیت کی پُوری طرح تائید کرتی ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔

فرماں برداری کرو اللہ کی اور فرماں برداری کرو رسولؐ کی اور اُن کی جو تم پر حکم کے مالک ہیں۔ پھر اگر تم میں کسی معاملے میں نزاع پیدا ہو جائے تو اُسے خدا اور رسُولؐ کے سامنے پیش کر دو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اطاعتیں واجب فرمائی ہیں اور ان کے درمیان جو بنیادی فرق ہے اُسے بھی بیان کر دیا ہے۔ اللہ اور اس کے رسُولؐ کی اطاعت تو مستقل طور پر واجب ہے اور اولو الامر کی اطاعت کو ان دو اطاعتوں کے تابع رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اولوالامر کی اطاعت کے ساتھ فعل حذف کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ رسُولؐ کی اطاعت اُن کی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ قیامت تک یہ ہم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ خدا کی اطاعت۔ اولوالامر کی اطاعت ان دونوں اطاعتوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے یہ مستقل نہیں بلکہ عارضی ہے اور یہ اللہ اور اس کے رسُولؐ کی اطاعت کے تابع ہے۔ ہمارے اسلاف اس فرق سے کتنی اچھّی طرح واقف تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کبھی بھی آپؐ کے کسی حکم کے بارے میں قرآن سے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ نہیں کیا مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا وہ اپنے حکمرانوں اور ائمہ سے ہر کام میں قرآن و احادیث سے دلائل پیش کرنے کا مطالبہ کرتے رہے۔

مذہب کے بغیر انسانیّت

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم دینی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم میں بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔ مرحوم نے اپنی بیشتر تحریروں میں ان مغربی علوم کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ آج کا انسان انسانیت کے جس جوہر گراں بہا سے محروم ہے اُس کی وجہ صرف اُس کا مذہب سے لاتعلق ہونا ہے۔

مرحوم نے اس موضوع پر بہُت کچھ لکھا اور خوب لکھا۔ اس سلسلے میں مرحوم کی تصانیف "انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام" اور "مغربی تہذیب کے سرچشمے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی اندرون و بیرون ملک بڑی پذیرائی ہوئی۔ زیر نظر مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

دنیا پرستوں کی طرف سے یوُں تو ہر زمانے میں مذہب کے خلاف ایک جذبۂ نفرت موجود رہا ہے، مگر دَورِ جدید میں سوشلزم کے فروغ کے ساتھ اس جذبے میں غیر معمولی شدّت پیدا ہوئی ہے اور بعض لوگ جذبۂ نفرت کے مختلف پہلوؤں اور اس کے منطقی نتائج پر غور کیے بغیر یہ کہنے لگے ہیں کہ آخر انسان مذہب کے اثرات سے آزاد ہو کر کیوں بہتر اور شادکام زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے کبھی کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا وہ

تو خیر اسی راہ پر گامزن رہیں گے اور اُس وقت تک اپنے دل میں مذہب کے خلاف نفرت کے جذبات پالتے رہیں گے جب تک کہ لادینیت اپنی ساری ہولناکیوں کے ساتھ دنیا پر مسلّط ہو کر انسانی زندگی کو پوری طرح جہنم نہ بنا دے۔ لیکن وہ حضرات جو وقتی نعروں سے فوراً اثر قبول کرنے کے عادی نہیں ہیں اور آنے والے حالات و واقعات پر غور و فکر کرنے کے خوگر ہیں اُنھیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ کیا مذہب کے بغیر انسانیت زندہ بھی رہ سکتی ہے؟ اور اگر مذہب دنیا سے رُخصت ہو جائے تو پھر انسانیت ناگزیر طور پر کس خوف ناک انجام سے دوچار ہو گی؟

اس مسئلہ پر بحث سے پیشتر چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) ہمیں مذہب کی بگڑی ہوئی صورتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر بعض چالاک اور عیّار لوگوں نے دنیوی مفادات کی خاطر مذاہب کا حلیہ بگاڑا ہے تو یہ اُن کی عیّاریاں ہیں۔ مذہب کو اس سلسلے میں کسی طرح بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

(۲) دنیا کے مذاہب نے اپنی اپنی جگہ فکر و عمل کا جو نظام دیا ہے وہ بھی اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ ہمیں نفسِ مذہب کی ناگزیر ضرورت اور اس کی غیر معمولی افادیت سے بحث کرنا ہے۔ ہمیں ان صفحات میں صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر دنیا سے مذہبی افکار و احساسات بالکل ختم ہو جائیں تو پھر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کیا نقشہ اور انداز ہو گا اور کیا اُس نقشے اور انداز کو متمدّن زندگی کہا جا سکے گا۔

مادّیت کے پرستاروں نے مذہب کو بے وزن اور بے کار ثابت کرنے کے لیے جس انداز سے اس کے ارتقاء کی داستان مرتب کی ہے وہ بڑی غلط ہے۔ اُن کا چونکہ سارا زور اس بات پر ہے کہ اصل چیز مادہ

ہے اور خدا بھی چونکہ مادہ کی اس خارجی دُنیا کا انسان کے ذہن میں عکس ہے۔ اس لیے خدا کے بارے میں انسانی تصوّرات خارجی حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں۔ آغاز میں جب انسان کے علم اور مشاہدے کا دائرہ محدود تھا تو وہ لاتعداد مظاہرِ قدرت کو خدا مان کر اُن کی پرستش کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب اُس کے علم کا دائرہ وسیع ہُوا اور اُس کے اندر مظاہرِ کائنات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو خداؤں کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور پھر ایک خدا کا تصوّر باقی رہا اور اب اس خیالی پیکر سے بھی انسان کو نجات ملنی چاہیئے، کیونکہ یہ بھی محض واہمہ ہی ہے۔

خدا کے بارے میں یہ پورا فلسفہ من گھڑت ہے جس کا حقیقت سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ خدا کا وجود خارجی حالات کا عکس نہیں بلکہ وہ ایک ایسی زندہ اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جسے تسلیم کیے بغیر اس کائنات میں انسانی زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسان کی فطرت اور اس کے قلب و دماغ میں خدا کے وجود کا احساس اسی وقت ودیعت کر دیا گیا تھا جس وقت ابوالبشر کی تخلیق کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ذات کے شعور و احساس کی بنا پر ہی اس کے اندر اخلاقی احساس پیدا ہوتا ہے جو اُسے دوسرے حیوانات سے ممیّز اور ممتاز کرتا ہے۔ توحید کا تصوّر ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے انسان کے قلب و دماغ میں پیدا نہیں ہُوا بلکہ وہ اوّل روز ہی سے موجود ہے۔ یہی تصوّر صحیح اور برحق ہے اور اسی تصوّر سے انسان کے اندر صحیح اخلاقی شعور جنم لیتا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ انسان نے مدّت دراز کے بعد توحید کے تصوّر کو اپنایا، بالکل غلط ہے۔

عہدِ جدید میں انسانیات کے ماہرین نے بعض قدیم قبائل کے افکار و اعمال کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس جائزہ کے لیے ایسے قبائل کو منتخب کیا گیا ہے جو آج کی متمدن دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہیں، جن کا اندازِ زلیست پتھر ادوار کا ہے

کے ادوار سے ملتا جلتا ہے، لیکن وہ ہر مظاہرِ قدرت کی پرستش کے بجائے خالص توحید کے قائل اور ایک خدا کے پرستار ہیں۔ اس سلسلے میں یُوں تو بہت سے محققین نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں مگر شمیٹ (SCHMIDT) اور ایچ جے روز (ROSE) دو جرمن اہلِ قلم کی تصریحات قابلِ غور ہیں۔ اُنھوں نے افریقہ اور آسٹریلیا کے متعدد قدیم قبائل کے حالات کا بڑی دقّتِ نظر سے جائزہ لیا اور پھر اپنی تحقیقات کو ایک کتاب "مذہب کا آغاز اور اُس کا نشوونما" کی صورت میں مدوّن کیا ہے۔ اُنھوں نے صاف طور پر یہ کہا ہے:

"قدیم تمدّن میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ذات خدائے واحد کی ہے اور جو مذہب ایک خدا کو تسلیم کرتا ہے وہ توحیدی مذہب کہلاتا ہے۔ اس صورتِ حال پر بہت سے مصنّفین نے اعتراضات کیے ہیں۔ ان کے جواب میں مَیں یہ کہتا ہوں کہ بہت سے قبائل ایسے ہیں جن کے ہاں ایک ارفع و اعلیٰ ذات پر ایمان اُن کے توحیدی مزاج کی واضح علامت ہے۔ یہ حقیقت بہت سے پگمی قبائل (PYGMY) قدیم بُش من (BUSHMEN) کرنائے (KURNAI) کیولن (KULIN) اور جنوب مشرق کے یون قبیلے کے متعلّق وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔[1]"

ان نیم متمدّن قبائل کے ہاں، جنہیں علم کی ہوا تک بھی نہیں لگی، توحید کا تصوّر اُس حقیقت پر شاہد ہے، جسے قرآن مجید نے پیش کیا ہے، کہ انسان کی فطرت کو صحیح مذہب پر بنایا گیا اور پھر اوّل روز ہی سے اُس کے لیے ہدایتِ الٰہی کا سامان کیا گیا۔ لہٰذا وہ ابتدائے آفرینش ہی سے خدا، وحی، حشر و نشر، اور رسالت کے بارے میں صحیح قسم کے احساسات رکھتا ہے۔ اگر وہ اس فطری

---

1. *The Origin and Growth of Religion*, page 262.

حالت سے الگ ہو کر کوئی دوسری روش اختیار کرتا ہے تو یہ گمراہی کی راہ ہے جسے اُس نے خود اختیار کیا ہے۔

مذہب کے مطالعہ سے اصل صورتِ حال یہ سامنے آتی ہے کہ قادرِ مطلق نے جب انسان کو مادّی اور روحانی احتیاجات کے ساتھ اس کرۂ ارضی پر اُتارا تو ان دونوں قسم کی احتیاجات کی تسکین کا سامان بھی فراہم کیا۔ جس طرح اُس نے انسان کی بھوک، پیاس اور صنفی خواہش کو پُورا کرنے کے لیے خوراک، پانی اور اُس کے لیے جوڑے کا انتظام کیا بالکل اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اُسے ایک واضح نظامِ ہدایت بھی عطا فرمایا تاکہ اس کی روح تشنہ نہ رہے۔ مثلاً ہر انسان میں جبلّی طور پر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ یہ جانے کہ اس عالمِ محسوسات سے ماوراء کیا ہے؟ اس کا جواب اسے یہ دیا گیا کہ اس عالمِ محسوسات سے ماوراء ایک ارفع و اعلیٰ روحانی نظام موجود ہے جو برابر انسان پر اثر انداز ہو کر اُس کے اندر اخلاقی احساسات پیدا کرتا ہے۔ پھر انسان اپنے متعلق یہ جاننے کے لیے بھی آرزو مند رہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟ اس کا جواب بھی اُسے یہ دیا گیا کہ اُس کا آغاز بھی اُس قادرِ مطلق ذات نے کیا ہے اور انجام کار بھی وہ اُس کے حضور میں حاضر ہو گا۔ پھر دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے اندر

دیکھے بھالے، بِن سوجھے
جانے پہچانے، بِن بُوجھے

وجود کا احساس موجود نہ ہو۔ ہر فرد کائنات کی اس بنیادی حقیقت کے بارے میں سوچتا ہے اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لے۔ دنیا میں کوئی فرد ایسا نہیں جو اس احساس سے خالی ہو۔ یہ احساس انسان کے اندر اسی طرح ایک گہری خلش پیدا کرتا ہے جس

طرح کہ بھوک اور پیاس یا دوسری جبلّی خواہشات خلش پیدا کرتی ہیں۔ یہ احساس وقتی طور پر دب تو سکتا ہے مگر مٹ نہیں سکتا اور ہلکی سی لے کی طرح ہر وقت موجود رہتا ہے۔ انسان اس حقیقت سے تو بہر حال واقف ہے کہ اس کی ہر شعوری اور جذباتی کیفیت کے لیے ایک معروض (OBJECTIVE) کا ہونا ضروری ہے۔ اگر غصّہ آ جائے تو کسی بات یا شخص پر ہوگا۔ خوشی پیدا ہوگی تو کسی چیز یا خیال سے پیدا ہوگی۔ اب اگر دوسری نفسی کیفیات کے لیے معروض کا وجود ضروری ہے تو انسان کی اس سب سے بڑی اہم کیفیت کے لیے معروض کیوں نہ ہو۔ اس کا جواب بھی مذہب نے یہ دیا ہے کہ یہ کیفیت انسان کی روحانی اور اخلاقی اساس ہے اور اس کا معروض دُنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے جو خارجی دنیا میں سُورج سے زیادہ روشن اور داخلی طور پر اس کی اپنی زندگی یعنی شاہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

(ابراہیم ۱۰)

رسولوں نے کہا کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔

یہ سارے احساسات جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے انسانی نفس کے بنیادی احساسات ہیں جن سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ پھر ان کی نوعیت ایسی ہے کہ کوئی انسان محض مادّی زندگی کے شواہد اور حقائق سے ان کی تسکین نہیں کر سکتا۔ آخر سوچیے کہ اس عالمِ محسوسات سے ماوراء حقیقتِ کُبریٰ کو جاننے اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کو ہم آہنگ کرنے کی آرزو کو یہ کہہ کر کس طرح پُورا کیا جا سکتا ہے کہ یہ محض وہم ہے؟ یہ سارے احساسات تو کسی گہری روحانی اور وجدانی کیفیت کے ترجمان ہیں جن کی تسکین انباء الغیب ہی سے ممکن ہے۔ اگر ہم ان کی نفی کر دیں تو یہ احساسات تو مٹ نہیں سکتے۔ یہ اپنی تسکین کے لیے کوئی

اور راستہ اختیار کر لیں گے۔ ہم یہاں اس راستہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس پر گامزن قافلہ انسانیت کے مصائب اور دشواریوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ مذہب کے دشمن جھٹ سے یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ مذہب انسانوں کے لیے افیون اور سامراج کے ہاتھ میں ظلم کا ہتھیار ہے۔ مگر انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مذہب کے بغیر انسانیت کی کس طرح مٹی پلید ہوتی ہے۔

بعض سادہ لوگ اس فریب میں بھی مبتلا ہوتے ہیں کہ دنیا کی بعض قوموں نے مذہب کو تیاگ کر بھی ایک اجتماعی زندگی کی بنیاد رکھی ہے اور یہ اس بات کی شہادت ہے کہ مذہب کے بغیر بھی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ یہ صورتِ حال کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ مذہب سے انسان چونکہ ہزاروں سال سے مانوس چلا آرہا ہے اس لیے اس کے لاشعور میں بھی ابھی تک اخلاقی احساسات موجود ہیں اور ان کی وجہ سے وہ ابھی تک بعض ایسی بنیادی انسانی صفات سے یکسر محروم نہیں ہوا جن کے ناپید ہونے سے اُس کی زندگی پوری طرح درندگی کا نمونہ بن جائے۔ انسان کا حشر اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوگا جب وہ اِن اخلاقی احساسات سے یکسر تہی دامن ہو جائے گا۔

دوسرے ابھی تک یہ قومیں دورِ تعمیر سے گزر رہی ہیں اس لیے ان کے سامنے لادینیت کے منطقی نتائج اُبھر کر سامنے نہیں آئے۔ پھر دوسری قوموں کے خلاف ان کے دل میں جو بے پناہ جذبۂ نفرت وحقارت پیدا کر دیا گیا ہے اس سے بھی ان کے اندر ایک مصنوعی قوتِ عمل پیدا ہوئی ہے جس نے ان کے اخلاقی شعور کو وقتی طور پر اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ان کے اندر احساسِ زیاں باقی نہیں رہا۔ مگر انسانوں کے اخلاقی شعور یا دوسرے لفظوں میں ان کی انسانیت کو دیر تک اس حالت میں نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ ترقی کے اس طلسم کے ٹوٹتے ہی بیدار ہو گی اور اس وقت اسے یہ احساس ہوگا کہ اُسے ان احساسات سے محروم کر کے اس کے ساتھ شرمناک کھیل کھیلا گیا ہے۔ اس بنا پر مذہب

دُشمن قوتوں کی موجودہ صورتِ حال کو لادینیت کے حق میں وجہِ جواز نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ اس صورتِ حال کے نتائج ابھی کھل کر سامنے نہیں آئے۔ مذہب کے بغیر انسانیت کا حلیہ کس طرح بگڑے گا، موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس کا ایک ہلکا سا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے انکارِ خدا ہی کو لیتے ہیں۔

خدا کی ہستی کا شعور و ادراک، جیسا کہ ہم پہلے گزارش کر چکے ہیں، انسانی فطرت کا بنیادی تقاضا ہے۔ انسان اس احساس سے ایک لمحہ کے لیے بھی دستکش نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اس احساس کی تسکین کے لیے صحیح راہ نہیں پاتا تو وہ نہ صرف انسانیت کے سب سے شیریں عنصر سے محروم رہتا ہے بلکہ بڑی غلط راہوں پر چل نکلتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن قوموں نے خدا کا انکار کیا اُنھوں نے قومیّت یا ریاست جیسے جھوٹے خداؤں کی پرستش اختیار کی اور اپنے جذبۂ روحانی کی تسکین کے لیے ان کے ساتھ اس طرح کا والہانہ جذبۂ عقیدت استوار کیا جس طرح کہ ایک خدا پرست انسان سچے خالق اور مالک کے ساتھ کرتا ہے۔ ایک فلسفی نے کس قدر صحیح کہا ہے کہ خدا کے ساتھ روحانی تعلق انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ وہ اگر اس تعلّق کے لیے خدا کو نہیں پہچانتا تو پھر شیطان کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ قوم، وطن یا مملکت کی پرستش کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس ایک معبود کے سامنے دوسروں معبودوں کا ابطال کیا جائے۔ اس احساس کے تحت جارحانہ قوم پرستی کا نظریہ پیدا ہُوا جس کی رُو سے دُنیا کی ہر قوم دوسری قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تُل گئی۔ پھر اپنے گھر کے اندر قوم کے سارے افراد نے اُسے خُدا سمجھ کر اس کے ہر جائز و ناجائز مطالبے کو پُورا کرنے کی کوشش کی اور اسی کو ہی زندگی کی معراج خیال کیا۔ ظاہر بات ہے کہ قومی مطالبے قوم اور وطن کے سربراہوں کی زبان ہی سے ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان سربراہوں کو معاشرے میں اسی بلند مقام پر فائز

کر دیا گیا جس مقام پر کہ مذہب میں خدا کے پیغمبر فائز کیے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے روحانی احساسات کی تسکین کے لیے جو مادی مذہب اختیار کرنے پر مجبور ہوا ہے اس میں خدا کی جگہ قوم کی پرستش اور رسول کی غیر مشروط اور خوشدلانہ اطاعت کی جگہ اربابِ اختیار کی بے چون و چرا اطاعت موجود ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس اندازِ فکر اور طرزِ عمل سے انسان کی روح کو تسکین حاصل ہو سکتی ہے؟ قوم اور وطن دونوں الوہیت کے اس لطیف اور شیریں عنصر سے عاری ہیں جو انسان حق تعالیٰ کی بلند و بالا ذات میں پاتا ہے۔ انسان فطری طور پر عالمِ محسوسات سے ماوراء کسی اعلیٰ و ارفع ذات سے رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا آرزومند ہوتا ہے اور اسے جب کسی پیکرِ محسوس کی پرستش پر آمادہ کیا جائے تو وہ لازمی طور پر اپنی زندگی میں ایک خوف ناک خلا محسوس کرتا ہے۔ پھر اس کے قلب و دماغ کو یہ دیکھ کر بھی شدید اذیت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو وہ اس جھوٹے خدا کے ترجمان اور اس کے احکام کے شارح قرار دیکر اُن کی غیر مشروط اطاعت کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہے وہ بھی اپنے اندر کوئی ایسی روحانی اور اخلاقی کشش نہیں رکھتے جس سے انسان کی رُوح تسکین حاصل کرے اور اسے یہ محسوس ہو کہ ان مقدس ہستیوں کی پیروی سے وہ اپنے آپ کو ایک روحانی نظامِ اخلاق سے ہم آہنگ کر رہا ہے۔ جارحانہ قوم پرستی کے ان رہنماؤں کی اطاعت سے ان کی رُوحیں مجروح ہوتی ہیں کیونکہ انھیں ہر قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وُہ جبر و استبداد، مکر و فریب، خود غرضی اور دنیا پرستی کی راہ پر گامزن ہیں اور ان کی زندگی لطیف احساسات سے یکسر تہی دامن ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ قوم یا مملکت کی خدائی کا نقش دلوں پر مستقل طور پر قائم رکھنے کے لیے اور عوام کو اربابِ اختیار کا پرستار بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی حمد و ثناء میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں۔ اُنھیں ایسی غیر معمولی اور مافوق البشر صفات کا

مظہر قرار دیا جائے جن کی بنا پر ان کے اندر الوہیّت کی شان پیدا ہو۔ اس احمقانہ اور خطرناک رجحان نے پُوری دنیا کی اخلاقی حالت کو جس طرح متاثر کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور اس سے جو مزید فتنے پیدا ہونے کا امکان ہے ان کا تصوّر بھی کچھ مشکل نہیں۔

مذہبی احساسات سے محروم ہو کر انسان اپنی انسانیت کو بھی برقرار نہ رکھ سکے گا۔ آپ غور کریں کہ انسان اگر حیوان سے ممیّز و ممتاز ہے تو اس کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ اخلاقی احساسات رکھنے کی بنا پر اپنی حسّی اور مادی خواہشات کو اخلاقی حُدود کے اندر رہ کر پُورا کرتا ہے اور ان احساسات کی وجہ ہی سے وہ مادّی سُود و زیاں سے بلند تر ہو کر اچھے اور پاکیزہ مقاصد کے حصول کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیّار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کا اخلاقی شعُور، جو مذہبی احساس کی وجہ سے قائم ہے، ختم ہو جائے تو پھر انسان کے اندر حسّی لذات اور مادّی مفادات سے بلند تر ہو کر سوچنے اور اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے حصول کی خاطر زندہ رہنے کی کوئی تمنا باقی نہیں رہتی اور انسان زندگی کا وہی نہج اختیار کر لیتا ہے جو حیوانوں کا ہے۔

اخلاقی احساس کی عدم موجودگی میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسانی عمل کا محرّک کیا ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ممکن ہے کہ جب روحانی اور اخلاقی احساس موجود نہ رہے تو پھر حسّی لذت کی تسکین، مادّی منفعت کی چاٹ اور نفع عاجلہ کی امید ہی کو عمل کا سب سے بڑا محرّک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر انسان کے اندر کسی بلند روحانی نصب العین کے حصول کی خواہش نہ تو لامحالہ وہ حسّی خواہشات کی تکمیل ہی کے لیے سرگرم عمل ہو گا۔ انسان کے لاشعور میں مذہب کے بچے کھچے اثرات موجود ہونے کی وجہ سے وہ ابھی تک زندگی کی اُس سطح پر نہیں اُترا جس پر اُسے فی الواقع اُتر جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر مذہب کے خلاف نفرت کا یہی جذبہ پرورش پاتا رہا تو پھر دُنیا کی کوئی قوّت اسے اس پست سطح پر اُترنے

سے نہیں بچا سکتی۔ وہ لوگ انسانی فطرت کے بارے میں شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ انسان کو مذہب کے بغیر بھی انسانیت کے وسیع تر مفادات کے لیے ایثار و قربانی پر اُبھار سکتے ہیں۔ یہ لوگ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ ایک مخصوص قسم کے نظامِ تعلیم و تربیت کے ذریعہ عوام کے اندر اجتماعی مفادات کی محبت پیدا کر کے انھیں غیر معمولی ایثار پہ آمادہ کر سکیں گے۔ مگر یہ لوگ شاید ایثار کی نفسیاتی کیفیت سے یکسر ناواقف ہیں۔ اگر کوئی انسان اپنے ذاتی مفادات کو وسیع تر مفادات کی خاطر قربان کرتا ہے تو وہ یہ عظیم قربانی بھی روحانی احساس کے تحت کرتا ہے۔ ورنہ حسّی لذات اور مادّی خواہشات تو انسان کے اندر خود غرضی اور نفس پرستی کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ انسان کے اندر اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے ایثار، بنی نوع انسان سے بے لوث محبت، دوسروں کے دُکھ درد میں ان سے تعاون، مصیبت کے وقت ان کی معاونت اور دستگیری، کمزوروں اور بے بسوں پر رحم، یہ سب روحانی احساسات کے مختلف مظاہر ہیں۔ اگر یہ احساسات مٹ جائیں تو پھر انسان خود غرضی اور شقاوتِ قلبی کا پیکر بن جاتا ہے، اور اپنے طرزِ عمل میں درندوں سے بھی زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں کیا کسی تہذیب کا نام و نشان باقی رہ سکتا ہے؟ اگر اخلاقی حس ناپید ہے تو پھر انسان کو اس بات کی آخر کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو قربان کر کے دوسروں کو آرام اور سکون فراہم کرنے کا التزام کرے اور کمزوروں اور بے بسوں کو دنیا سے مٹا کر اپنے وسائل میں وسعت پیدا کرنے کے بجائے اُن سے تعاون کرے اور انھیں زندہ رکھ کر ان وسائل میں اُنھیں شریک ٹھہرائے؟ سوچیے کہ آخر وہ کونسا جذبہ ہے جس کے تحت نوجوان اپنے بوڑھے والدین کا ہنسی خوشی بوجھ اُٹھاتے ہیں حالانکہ ان سے نفع کی کوئی امید باقی نہیں ہوتی۔ مادّی نقطۂ نظر سے تو یہ لوگ خاندان اور معاشرے پر بار ہوتے ہیں اور ان کا سب سے اچھا مصرف یہی ہے کہ ان کے نحیف اور بیکار وجود سے دنیا کو پاک کیا جائے اور

ان کے جسموں سے پیداوار بڑھانے کا کام لیا جائے۔

ایک نہیں، بہت سے ایسے قواعد و ضوابط جن کی پابندی لادینی عناصر اور معاشرے بھی کرتے ہیں ان کی تہ میں دراصل مذہب کے پیدا کردہ اخلاقی احساسات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔ ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح کو جو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی مذہبی احساس ہی ہے، ورنہ خالص مادّی نقطۂ نظر سے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ ان رشتوں میں ایک خاص نوعیت کی جو تقدیس پائی جاتی ہے وہ صرف مذہب کی رہینِ منت ہے۔ انسان خواہ زبان سے مذہب کا مخالف اور دشمن ہو مگر اس کے لاشعور میں بہن اور بیوی کے درمیان یا بیوی اور ماں کے درمیان جو ایک واضح امتیاز ہوتا ہے وہ مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ خالص حیوانی نقطۂ نظر سے اس تفریق اور امتیاز کا کوئی جواز نہیں۔

آپ غور کریں کہ اگر انسان اپنے حسّی محرّکات کے تحت ہی زندگی بسر کر سکتا تھا تو انسان کی ہدایت کے لیے آخر اتنے لاتعداد انبیاء کیوں بھیجے گئے؟ کائنات کی ان مقدّس ہستیوں کی جد وجہد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کا کام اگرچہ دنیا کا سب سے سخت ترین اور صبر آزما کام ہے مگر انسانوں کے کرنے کا یہی کام ہے کیونکہ انسانیت کا حقیقی جوہر اسی کام کے ذریعے کھلتا ہے اور اُس جوہر کی بدولت انسان نہ صرف حیوانوں کی سطح سے بلند ہوتا ہے بلکہ اخلاقی اور روحانی رفعتوں میں فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ فرشتوں میں تو حیوانیت کا کوئی عنصر سرے سے ہوتا ہی نہیں اس لیے وہ حسّی خواہشات کی لذّت سے یکسر محروم ہوتے ہیں اور اس بنا پر یہ خواہشات ان کے عمل کا کسی صورت بھی محرّک نہیں بن سکتیں۔ انسان کی اصل انسانیت بلکہ اس کی حقیقی عظمت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ حسّی خواہشات اور مادّی تمناؤں کی قوّت کو اپنے اندر محسوس کرنے کے باوجود اُنھیں اپنے آپ پر غالب نہ ہونے دے

بلکہ اُنھیں اخلاقی احساسات کا پابند بنا کر تعمیر و ترقی کی راہ پر لگائے۔ انسانیت درحقیقت انسان کی اپنی حیوانیت پر اس کی اخلاقی حس اور اس کی رُوح کی فتح کا دوسرا نام ہے اور یہ فتح و کامرانی مذہبی تعلیمات ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

مذہب نے اخلاقی احساس کو نہ صرف پیدا کیا ہے بلکہ اس کی پرورش کا بھی انتظام کیا ہے۔ اس احساس کے تحت انسان خاکی ہونے کے باوجود وطن کا پرستار نہیں بنتا بلکہ انسانیت کی وسیع تر برادری سے رشتۂ اخوّت استوار کرتا ہے۔ اسی احساس کی بدولت وہ مادّی سُود و زیاں سے بے پرواہ ہو کر زندگی کے بیشتر معاملات اخلاقی بنیادوں پر طے کرتا ہے۔ وہ اسی احساس کے تحت والدین کی عزت و تکریم کرتا ہے، کمزوروں اور ناداروں پر دستِ شفقت رکھتا ہے، بے سہارا لوگوں کو سہارا دیتا ہے، حالانکہ مادّی نقطۂ نظر سے یہ سراسر گھاٹے کے سودے ہیں۔ اِسی احساس سے اس کے اندر استغناء، تحمّل، بردباری، ایثار جیسی بلند و اعلیٰ صفات پرورش پاتی ہیں۔ پھر یہی احساس اس کے اندر اخلاص اور بے لوثی کی ایسی متاعِ عظیم پیدا کرتا ہے جس کی رُو سے وہ اپنی ساری خدمات اور قربانیوں کے بدلے میں کسی دنیوی فائدے یا شہرت یا عزت کا طلب گار نہیں ہوتا بلکہ وہ یہ سارے کام خدا کی رضا جوئی کے مقدّس جذبے سے کرتا ہے۔ خدا کی رضا کے لیے جینے اور مرنے کا عزم انسان کی پُوری زندگی کو خدا ترسی کا نمونہ بناتی ہے اور انسان زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام کو بڑے اخلاص کے ساتھ سرانجام دیتا ہے۔ اس مقدّس جذبہ کی موجودگی انسان کے اندر دورنگی اور منافقت ختم کر دیتی ہے۔ اور انسان سراپا اخلاص بن جاتا ہے۔

مذہب، مذہبی احساسات و معتقدات انسان کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہیں۔ مگر افسوس انسان ان کی اصل قدر و قیمت سے ناآشنا ہوتا جارہا ہے۔ چونکہ مادّی ذرائع و وسائل کی فراوانی نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اس لیے وہ اُس متاعِ عزیز سے غافل ہو گیا ہے جس سے اس کی انسانیت وابستہ ہے۔

ہوا اور روشنی ہماری مادی زندگی کے لیے جس قدر ضروری ہیں اس سے سب واقف ہیں، مگر ہم ان کی پوری طرح قدر نہیں کرتے کیونکہ یہ ہمیں بغیر کسی تکلیف اور محنت کے میسر آجاتی ہیں۔ اسی طرح مذہب جو انسانیت کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے اور جس پر اس کی اخلاقی اور روحانی زندگی کا سارا انحصار ہے ہم اس کی غیر معمولی اہمیت پہچاننے سے قاصر ہیں۔ جس طرح ہوا اور روشنی کی اصل قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب انسان اس سے محروم ہو جائے۔ اسی طرح مذہب کی حقیقی قدر و قیمت کا انسانیت کو اس وقت اندازہ ہوگا جب انسان اس گنجِ گراں مایہ سے بالکل تہی دست ہو جائے گا۔ اس وقت اُسے معلوم ہوگا کہ اس محرومی سے وہ زندگی کے کس پست مقام پر پہنچ چکا ہے۔ حیوانوں میں تو بعض ایسی جبلّتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ مل کر زندگی بسر کر لیتے ہیں، مگر انسان میں یہ جبلّتیں بڑی کمزور ہیں اور ان کے مقابلے میں خودغرضی کے جذبات زیادہ طاقت ور ہیں، اس لیے اس کے اندر اگر اخلاقی اور مذہبی احساسات باقی نہ رہے تو وہ درندوں سے بھی زیادہ خونخوار ہوگا۔ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ انسان مذہب کے شیریں اور حیات آفریں عنصر سے محروم ہو کر درندہ بن جائے کیونکہ اگر اس مقام پر پہنچ گیا تو پھر دنیا میں خیر و بھلائی کا نام و نشان نہ رہے گا۔

مشرقی ممالک میں اشتراکیّت

جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم اشتراکیت، سرمایہ دارانہ نظام، فاشزم اور دیگر ملحدانہ نظاموں کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اہلِ مشرق بالخصوص مسلمانوں کے خلاف اِن کی مذموم کارروائیوں کو بے نقاب کیا۔ ان کی ایک کتاب ISLAM AND THE REMAKING OF HUMANITY اس موضوع پر ایک مستند کتاب ہے جس میں اُنھوں نے اسلام، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اور ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی نمایاں فرق نہیں اور اَن ہر دو نظاموں کا مقصد صرف مغرب کی اس مادی تہذیب کو فروغ دینا ہے جس نے آج کے انسان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ مرحوم کے نزدیک آج کا انسان جن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہے ان کا واحد حل دینِ اسلام کو اپنانے میں ہے۔ زیرِ نظر مضمون مرحوم کے قلم سے اس موضوع پر لکھے گئے مضامین میں سے ایک ہے۔

مغربی ممالک میں جب صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا تو اس کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کیونکہ زود پیداواری اور کثیر پیداواری کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں ایسی منڈیاں تلاش کی جائیں جہاں سے اُنھیں بھاری مقدار میں نہایت سستے داموں مال فراہم ہو سکے اور جہاں وہ اسی مال کی مصنوعات

کو لوٹا کر بہت زیادہ قیمت وصول کر سکیں۔ اپنے اس مقصد کو اہلِ یورپ نے مختلف اوقات، اور مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے حل کیا۔ آغاز میں تو اُنھوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ مشرقی ممالک میں اُنھیں چند تجارتی سہولتیں حاصل ہو جائیں مگر ان کاروباری تعلقات میں جب ان پر مشرقی ممالک کی کمزوریاں آشکار ہوئیں اور اُنھیں اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں سیاسی غلبہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے تو اُنھوں نے فوج کشی کر کے ان ممالک پر بالجبر تسلّط قائم کر دیا۔ مگر اس تسلّط میں بھی ان کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ ان ممالک کو خام مال کی خرید اور مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے یہاں جو مدّت حکمراں کی حیثیت سے گزاری اس میں اجنبی بن کر رہے اور عام آبادی کے ساتھ گھُل مِل کر زندگی بسر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اس بات کا البتہ اُنھوں نے ضرور التزام کیا کہ مشرقی اقوام کا اپنی تہذیب، اپنے تمدّن، اپنے مذہب، اپنی روایات پر سے اعتماد متزلزل ہو اور ان کے اندر مغربی تہذیب و ثقافت اور مغربی افکار و نظریات کے لیے عقیدت کے جذبات پیدا ہوں۔ وہ اپنی دُنیا خود آباد نہ کر سکیں، اور اگر کبھی مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد بھی ہوں تو ذہنی غلامی میں گرفتار رہنا پسند کریں۔

اہلِ مغرب نے سیاسی تفوّق کے قیام کے ساتھ ہی اس امر کو بھانپ لیا تھا کہ مشرق کا بیدار ہونا یقینی ہے اور اس بیداری کے بعد اسے مدّتِ دراز تک سیاسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا امر محال ہو گا۔ چنانچہ اُس نے اس کے باشندوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے اپنا پُورا زور صرف کیا۔ اسے ایک ایسا نظامِ تعلیم دیا جس سے اُنھیں اپنے معتقدات، اپنے افکار و نظریات پر اعتماد کو سخت دھکا لگا۔ لیکن وہ اُنھیں مغربی تہذیب کا پُوری طرح پرستار نہ بنا سکے، اہلِ مغرب کی ان مذموم کارروائیوں کا سب سے زیادہ نقصان مسلمان قوم کو پہنچا اور ان کے ظلم و ستم کا ہدف زیادہ تر مسلمان ہی بنے۔

اسلام کے سوا مشرقی ممالک میں جتنی تہذیبیں اور جتنے فکری نظام تھے اُن میں سے کوئی تہذیب اور فکری نظام ایسا نہ تھا جو مغربی افکار سے براہِ راست متصادم ہو۔ جس طرح اہلِ مغرب نے مذہب کو زندگی کا ایک گوشہ تصوّر کر کے حیاتِ اجتماعی کی عمارت خالص مادہ پرستی کی بنیاد پر استوار کر رکھی تھی بالکل اسی طرح مسلمانوں کے ماسوا مشرق کی دوسری قوموں نے مذہب کو زندگی کے اجتماعی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ مذہب کو سیاست، معیشت اور معاشرت سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے اور ان سارے معاملات کو دنیوی نظریات و قواعد کے مطابق طے کرنا چاہیے۔

یہ اندازِ فکر اور یہ طرزِ عمل مسلمانوں کے ضمیر سے مغایرت رکھتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کے ساتھ سچّی اور گہری وابستگی انگریز کے اس برّصغیر میں آنے سے پہلے ہی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی ورنہ اسے یہاں قدم جمانے اور مسلمان ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ دنیا پرستی نے اس قوم کے بڑے حصّے کو خدا پرستی سے غافل کر دیا تھا، مگر اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اسلام سے اس عملی بے تعلقی کے باوجود اس حقیقت کے ہمیشہ معترف رہے کہ ان کی ذلّت اور رسوائی کا سبب صرف یہی ہے کہ اُنھوں نے اللّٰہ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں نے تو ترکِ مذہب کو فلاح کا ذریعہ سمجھا لیکن مسلمانوں نے اسے ہمیشہ اپنی تباہی و بربادی کا واحد سبب خیال کیا۔ یہ چبھتا ہوا احساس ان کے اندر ہمیشہ موجود رہا کہ ان کی زندگی کا نقشہ اللّٰہ اور اُس کی دی ہوئی تعلیمات سے مختلف ہے اور یہی ان کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے لہٰذا اگر وہ دنیا میں اقبال مند ہونے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے آرزو مند ہیں تو اُنھیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہیئے۔ مسلمانوں کے اندر یہی احساس مختلف تحریکات کی صورت میں وقتاً فوقتاً نمودار ہوتا رہا۔ شاہ ولی اللّٰہ اور اُن کے خاندان کی علمی کوششیں،

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور تحریکِ دیوبند، ندوہ اور اسی نوعیت کے دینی مدارس کا قیام، تحریکِ خلافت، تحریکِ پاکستان، سب اسی احساس کے مختلف مظاہر ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ مغربی تہذیب جس قوت کے ساتھ مسلمانوں کے اندر سرایت کرنے کی کوشش کرتی رہی اسی شدّت کے ساتھ تصادم ہوتا رہا۔ سطح بیں اہلِ مغرب اس آویزش کو مسلم قوم کی ہٹ دھرمی اور تعصّب پر محمول کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر جتنی کتب بھی منظرِ عام پر آئی ہیں ان کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں یہ قوم اپنی دشمن ہے اور اسے اپنی بھلائی اور برائی کی کوئی تمیز نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں اس امر کا صحیح طور پر جائزہ لیا گیا ہو کہ جب ساری قومیں مغربی تہذیب ہی میں اپنی فلاح ڈھونڈ رہی ہیں تو آخر مسلمان قوم کیوں بار بار اس سے متصادم ہوتی اور اس کا راستہ روکتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسری اقوام کے تعلقات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یوں تو اہلِ مغرب کی اس ناسمجھی کے کئی اسباب ہیں مگر ان میں دو بڑے نمایاں ہیں:

(۱) صنعتی انقلاب کے بطن سے الحاد کی جو تحریک نمودار ہوئی (اور جسے جنم دینے میں اس وقت کے مذہبی حلقے کا بڑا دخل تھا) اُس کا واسطہ ایک ایسے مذہب سے پڑا جس نے صدیوں پیشتر ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کے ضمیمے کی حیثیت سے زندہ رہنا گوارا کر لیا تھا اور اپنے اس مؤقف کو اپنا مقدر سمجھ رکھا تھا۔ اس وجہ سے الحاد کے تنگ نظر پادریوں اور ان کے خود ساختہ نظریات سے تو پنجہ آزمائی ضرور ہوئی مگر مذہب سے اس کا تصادم نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اس کشمکش کو غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ تاریخ کے اسی تجربے کو سامنے رکھ کر الحاد نے اسلام کے خلاف جنگ جیتنے کی کوشش کی اور یہاں بھی دینی رہنماؤں کو اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اسلام اور کفر کی اس کشمکش میں صرف علماء ان کے مدِمقابل بن کر آئیں گے مگر عام مسلم آبادی

اس سے بے تعلق رہنے گی اور وہ چند سو یا چند ہزار "ملاؤں" کو رُسوا اور بدنام کر کے یا ان پر مظالم ڈھا کر مغربی الحاد کو اُمّتِ مُسلمہ پر مسلّط کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گذشتہ دو سو سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اہلِ مغرب نے اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کے اس کے ساتھ تعلّقِ خاطر کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے، یہ دین چند "ملاؤں" کی اجارہ داری نہیں جنھیں مٹا دینے سے اُسے مٹایا جا سکتا ہو بلکہ یہ اُمّت کی عظیم اکثریت کی عقیدت اور محبت کا مرکز ہے اور اس کے قلب و دماغ میں یہ خیال پوری طرح راسخ ہے کہ اس کی بگڑی اگر کسی صورت میں بن سکتی ہے تو اسلام کو ہی سچے دل سے اپنا کر بن سکتی ہے۔ اس ایک صورت کے سوا اس کی فلاح و بقا کی دوسری صورت نہیں۔ امتِ مسلّمہ کا اسلام پر اعتماد ابھی جوں کا توں قائم ہے۔ یہ فی الحقیقت اس کی بڑی بدنصیبی ہے کہ کسی مسلمان ملک میں بھی سنجیدگی اور اخلاص سے یہ کوشش نہیں کی گئی کہ اجتماعی معاملات کو طے کرنے کے لیے رشد و ہدایت کے اس واحد سرچشمے کی طرف دل و جان سے رجوع کیا جائے۔ اسلام کا نام تو بلاشبہ وقتاً فوقتاً استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس مقدّس نام پر لوگوں کو دھوکے بھی دیے جاتے ہیں مگر اسے خلوصِ نیّت کے ساتھ اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کے دل میں اگر نفرت و حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں تو وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ اُن لوگوں کے خلاف ہیں جو اس مقدّس نام سے ناجائز فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کی تقدیس ان کے دلوں میں پوری طرح موجود ہے اور وہ اُسے ایک خاص مذہبی طبقے کی میراث نہیں سمجھتے بلکہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر جب اس پر کوئی آنچ آتی نظر آتی ہے تو وہ اس المیّہ کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ آگے بڑھ کر دشمن کی یلغار کو روکتے ہیں۔

(۲) اہلِ مغرب نے اس معاملے میں جس دوسری اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ الحاد اور مسیحیت کی پہلی جنگ سیاست، معیشت اور معاشرت

کے میدانوں میں نہیں لڑی گئی بلکہ تخیّلات اور مابعد الطبیعیات کے دُور دراز گوشوں میں لڑی گئی تھی۔ اہلِ مذہب نے مسیحیت کے نام پر کائنات کے بارے میں عجیب و غریب نظریات گھڑ رکھے تھے جن میں سائنسی انکشافات کے مقابلے میں آنے کی قوّت نہ تھی مگر ہر شخص میں نہ تو اتنا علم تھا اور نہ شعور کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کر سکتا اور یہ دیکھ سکتا کہ علمی تحقیقات کے سامنے توہمات زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے مقابلے میں آج اسلام اور الحاد کے درمیان جنگ ان میدانوں میں لڑی جا رہی ہے جن میں انسانوں کو کوئی فریب نہیں دیا جا سکتا۔ حقائق کا حقائق سے مقابلہ ہے، شواہد کی شواہد سے ٹکر ہے اور زندگی کے ٹھوس مسائل میدانِ عمل میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ مَیں اپنی اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

مغربی مفکّرین اور سائنسدانوں اور مسیحی پادریوں کے مابین جو آویزش ہوئی اس کا محور زمین کی حرکت، چاند کی گردش، کائنات کا آغاز و انجام یا اسی نوعیت کے دوسرے طبیعیاتی مسائل تھے۔ اس آویزش نے بعض اوقات تشدّد کی صورت بھی اختیار کی جس کے نتیجے میں نہایت قیمتی جانیں بھی تلف ہوئیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مسائل خواہ کتنی ہی بنیادی اہمیّت کے حامل ہوں اور ان پر تحقیق نتائج کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی دُور رس ہو، مگر ایک عام آدمی کے لیے یہ کوئی خاص اہمیّت نہیں رکھتے اور وہ بے چارا نہ تو اتنا علم رکھتا ہے اور نہ ایسے سائنسی آلات رکھتا ہے جو اُسے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دیں۔ اس کے نزدیک ان کی حیثیت سُنی سنائی باتوں کی سی ہے۔ جس دلیل پر دل کو اطمینان ہو گیا اُسے قبول کر لیا اور جس سائنس دان کے علم پر بھروسہ کر لیا اس کی تصریحات کو صحیح مان لیا۔ ان مسائل کے بارے میں عام لوگوں کے نظریات یا میلانات کوئی اہمیّت نہیں رکھتے۔

مگر اسلام اور الحاد کی کشمکش بالکل واضح ہے۔ اس کے مختلف محاذوں کو بھی

لوگ اچھّی طرح جانتے ہیں۔ جس گولہ بارود سے یہ لڑائی لڑی جارہی ہے اس کے عناصر ترکیبی کو بھی ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے، پھر جن مسائل میں تصادم ہورہا ہے وہ بھی سب لوگوں پر پوری طرح آشکارا ہیں اور ہر فرد ان کی نوعیت کو اچھّی طرح جانتا ہے اور پہچانتا ہے۔ مثلاً کون اس حقیقت سے آج ناواقف ہے کہ جس ملک میں سرمایہ داری آتی ہے وہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے، وہاں ملکی دولت کا بیشتر حصّہ ایک محدود طبقے کے اندر سمٹ کر رہ جاتا ہے، وہاں لوگوں کے اندر ہوس زر پیدا ہوتی ہے اور بے کسوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب اشتراکیت آتی ہے تو سنگین قسم کی آمریّت کا تسلّط قائم ہوتا ہے اور انسانوں کو بے جان آلات کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے منحوس سائے میں لطیف احساسات کی پنکھڑیاں مرجھا جاتی ہیں اور اخلاق اور رُوحانیت کی مٹّی پلید ہوتی ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو سُورج سے زیادہ روشن ہیں۔ اُنھیں جاننے کے لیے کسی گہرے علم، کسی وسیع تجربہ گاہ اور کسی بیش قیمت سائنسی سامان کی ضرورت نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو جنگ ان کھلے میدانوں میں لڑی جارہی ہو اس کے بارے میں عام آبادی کو کسی قسم کے دھوکے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ تلخ اور افسوس ناک حقیقت آخر عوام کی نظروں سے کس طرح مستور رہ سکتی ہے کہ جن جن ممالک کی طرف سرمایہ داری اور اشتراکیت نے رُخ کیا وہاں دنیا پرستی کا دَور دورہ ہوا اور خدا سے بغاوت اور مذہب سے انحراف کی راہ ہموار ہوئی اور انسان نے مادّی دنیا اور اس کی لذات ہی کو اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب قرار دیا۔

ان حقائق کے کھل کر سامنے آجانے کے بعد اگر مسلم قوم کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ سرمایہ داری اور اشتراکیّت دونوں لعنتوں میں سے کسی لعنت کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ اہل مغرب نے ایک طویل تجربے کے بعد اس حقیقت کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے اس لیے اُنھوں نے

اب مسلمانوں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ طریق کار اختیار کر رکھا ہے کہ سرمایہ داری نے مسلم ممالک میں جس افلاس کو جنم دیا ہے، اس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور عوامی جذبات کو مشتعل کر کے مسلم قوم کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اس کی غربت اور فاقہ مستی کا اگر کوئی کارگر علاج ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اشتراکیت کی راہ اختیار کرے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ سرمایہ کاری اور اشتراکیت تو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کی آپس میں سر پھٹول بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر سرمایہ داری مسلم ممالک میں اشتراکیت کی کیونکر ہمنوائی کر سکتی ہے۔ مگر یہ حالات کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی اساس مادیت ہے۔ اس بنا پر اصل کے اعتبار سے وہ دونوں ایک ہیں۔ ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ محض طریقِ کار کا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں مادّیت کی یلغار پیدائشِ دولت سے شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مذہب و اخلاق کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور ملک کے سارے وسائل کو براہِ راست اپنی تحویل میں لینے کے بعد مذہب، اخلاق اور معاشرت پر حملہ آور ہوتی ہے اور اس پر اپنا تسلّط قائم کرتی ہے۔

اشتراکیّت کی تیکنیک زیادہ مؤثر اور انقلاب انگیز ہے کیونکہ اقتدار پر بالجبر قبضہ کرنے کی وجہ سے کسی قوم کی پوری دولت، اس کے سارے وسائل اور ملک کی پوری انتظامی مشینری، الغرض اس کی پوری قوت اس کے ہاتھ میں سمٹ آتی ہے اور پھر کوئی ادارہ یا گروہ اس کی غیر معمولی طاقت کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ مسلمان قوم کو مغربی تہذیب میں رنگنے اور اسے معاشرتی، معاشی اور فکری اعتبار سے مغرب کا غلام بنانے کے لیے اشتراکی انقلاب زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک یہ حربہ کس قدر مؤثر ہے اس پر کئی ایک کتب شائع ہوئی ہیں۔ ہم ذیل میں ایک کتاب "تجدّد کا چیلنج[1]" کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں جس

1. *I.R. Sinai, The challenge of Modernization*

سے یہ معلوم ہوگا کہ سرمایہ دارانہ ممالک مشرقی ممالک میں اشتراکیت کے فروغ کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے تسلط کے لیے آمریت کی کیوں تائید کرتے ہیں۔

"ظاہر بات ہے کہ جو انقلاب پسند طبقہ (معاشرے کی مغربی نظریات کے مطابق) تجدید کے لیے آگے بڑھے گا وہ اس کام کو آزاد جمہوری فضا کے اندر سرانجام نہ دے سکے گا۔ ان نظریات کے تسلّط کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ معاشرتی اور معاشی قوّت کا بیشتر حصہ حکومت کے قبضے میں ہو، تاکہ وہ رائے عامہ کے علی الرغم بہت سے ناپسندیدہ اقدام کر سکے اور لوگوں کی روایات اور ان کے دل پسند نظریات کو ہدفِ تنقید بنا سکے۔ معاشی ترقی کا خواب آزاد معیشت میں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

جمہوریت ہر بیماری کا تریاق نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ہر ملک کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ انسانی ارتقاء میں بعض ایسی منازل بھی آتی ہیں جن میں مطلق العنانیت ایک ناگزیر ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ (اُس قوم کے دل و دماغ کو) صدیوں کی روایت کے ملبے سے صاف کیا جائے اور جاہل عوام پر ایسے تغیرات ٹھونسے جائیں جنھیں وہ خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ مشرقی قوموں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تبدیلی سے پہلے غیر معاشی حالات میں تغیر لایا جائے۔ اس بنا پر ان سارے ممالک کی اوّلین ضرورت یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی نئی قیادت کو اُبھارا جائے جو ان سارے تغیرات کے بوجھ کو اُٹھانے اور ان کے خطرات کو مول لینے کے لیے تیار ہو اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اس بات کا مصمم ارادہ رکھتی ہو کہ اسے اپنے معاشرے کی روایات کو قوت کے ساتھ توڑنا ہے اور عوام کو اُس غیر معمولی ایثار کے لیے آمادہ کرنا ہے جو اہلِ مغرب کو مختلف تغیرات میں سے گزرتے ہوئے کرنا پڑا۔

یہ نئی قیادت اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑی سخت اور متشدد ہونی چاہیئے اور اُسے اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہیے کہ وہ جمہوری طریقوں سے حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کی سیاسی بصیرت میں صرف دو عزائم ہی کارفرما ہونے چاہییں۔

(۱) معاشرے کو زیر و زبر کرنے کا عزم۔ (۲) اور معاشرے کو ایک آہنی نظم و ضبط میں جکڑنے کا ارادہ۔

اس نئی قیادت کو یہ بات پُوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ روایتی اداروں اور روایتی افکار کے اندر تبدیلی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ یک لخت ہی لائی جاتی ہے۔ کسی معاشرے کے مختلف شعبوں میں پیوند کاری یا اس کے کسی ایک گوشے میں تبدیلی نئی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ اس بنا پر نئی اور بامقصد قیادت کو ایک وار میں زندگی کا پُورا ڈھانچہ بدل دینا چاہیئے تاکہ اس کا ماضی سے آناً فاناً رشتہ منقطع ہو جائے اور اس کے اندر نئی متوازن عادات اُبھر سکیں۔ اس مقصد کے حصُول کے لیے ضروری ہے کہ یہ نئی قیادت ایک ایسی آمرانہ ریاست کی تشکیل کرے جو مروّجہ نظام کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے اور ایک ہی دھکے کے ساتھ لوگوں کو اپنی روایات کی دلدل سے نکال دے اور ان کے قدیم معتقدات اور مذہبی اعمال پر پُوری شدّت سے حملہ آور ہو۔ نیز اس قیادت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ فرد کے حقوق کو نظر انداز کرے، معاشرے میں جن اداروں، گروہوں کو کسی قسم کے تحفظات حاصل ہیں اُنھیں ان سے محروم کرے اور کسی جماعت یا مفاد کو تجدّد کی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔

یہ نئی قیادت جس گروہ کو معرضِ وجود میں لائے گی وہ بڑا سخت جان، بڑا منظم اور تنظیمی صلاحیتوں سے پُوری طرح بہرہ مند ہوگا۔

اس میں بلاشبہ کچھ خامیاں بھی ہوں گی مگر اس میں اتنی قوت اور خود اعتمادی ضرور ہوگی کہ وہ تجدید کی راہ کی ان ساری رکاوٹوں کو دُور کر سکے جنھیں بعض معاشرتی روایات نے جنم دیا ہے۔

اس نئی قیادت کو سب سے پہلے سُست رفتار معاشرتی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے اور مغرب میں نشاۃ ثانیہ اور تحریک احیاء العلوم نے جس روح کو جنم دیا ہے اُسے اچھی طرح اپنا کر آگے بڑھنا ہے۔ مغربی اقدار، مغربی احساسات، مغربی محاسن اور مغربی نقطۂ نظر سے قائدانہ صلاحیّت کو اپنائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ اور جب تک مشرقی معاشرے اپنے آپ کو مغرب کی ساری صفات سے اچھّی طرح متصف نہیں کر لیتے، ان میں جدید مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک ایسا نیا نصبُ العین درکار ہے جو نہ صرف معاشرتی اقدار کے قدیم پیمانوں کو پُوری قوت کے ساتھ تبدیل کر دے بلکہ نئے نظامِ اخلاق کی بھی صورت گری کرے۔

یہ نصب العین ایک ایسا تیزاب ہو جس میں مرّوجہ معاشرتی روابط خود بخود تحلیل ہو کر رہ جائیں۔ اس انقلاب انگیز نصب العین کی کئی شکلیں اور صُورتیں ممکن ہیں مگر اس کا مقصد بہر طور یہ ہونا چاہیے کہ وہ مذہب اور اس کی رُوایات کی بے ہنگم قوتوں کو پامال کرے اور توڑے اور ایک ایسا نیا مضبوط انسان پیدا کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہو جو اپنے آپ کو پُوری طرح تبدیل کرے اور معاشرے کو بھی مکمّل طور پر بدل ڈالے۔ جب تک اس نئے نصب العین میں لوگوں کی زندگیوں میں بالجبر انقلاب لانے اور پُرانی روایات کو توڑنے کی قوّت پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی روایات جنہوں نے ذہنوں کو زنگ آلود کر کے عوام کی صلاحیتوں

کو بے کار بنا دیا ہے، اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں حرّیت اور آزادی کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔"

مسٹر سنیائے نے اپنی کتاب میں مشرق کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے جو نسخہ پیش کیا ہے اس کے اجزاء کا بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کس چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بربادی کا یہ مرکّب تیار کیا گیا ہے اور اگر مشرق کی کوئی ہوش مند قوم اس کی ہولناکیوں کا احساس کرتے ہوئے اس زہر کو پینے سے انکار کر دے۔ تو اسے زبردستی پلانے کے لیے کس تشدّد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ سارا پروگرام اس مفروضے پر طے کیا گیا ہے کہ مشرق کی ساری اقوام فکر و نظر کے اعتبار سے تہی دامن ہیں۔ وہ اپنے پاس کوئی ایسا انقلابی نصب العین اور ضابطہ نہیں رکھتیں جن کے بل پر وہ دنیا میں عزّت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ اُنھیں اگر دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب و تمدّن کو پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں۔ مگر یہ ہمہ گیر انقلاب کسی مشرقی قوم کو آزادی کی فضا مہیّا کر کے جمہوری طریق سے لایا نہیں جا سکتا، کیونکہ ان اقوام کا مذہب اور اس کی روایات اس انقلاب کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دُور کرنے اور مشرقی قوموں کو بالجبر مغربی تمدّن میں رنگنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُنھیں ایسے انقلاب انگیز نصب العین کو اپنانے پر مجبور کر دیا جائے جس سے ان کے فکر و نگاہ کے زاویے اور جذبہ و احساس کے ڈھانچے دفعتاً تبدیل ہو جائیں، اور وہ خود اپنی مذہبی روایات توڑ کر اور اخلاقی ضابطوں سے بغاوت کر کے مغربی افکار و نظریات اور مغربی تمدّن کی علمبردار بن جائیں۔

کسی قوم کو اس کی روایات سے بیگانہ بنانا کوئی ایسا آسان کام نہیں جس کے لیے وہ خوشدلی سے تیار ہو جائے۔ اس بنا پر مسٹر سنیائے نے کھُل کر یہ کہا

ہے کہ یہ کام آمریّت، تشدّد کی مدد سے ہی بخوبی سرانجام دے سکتی ہے۔ چنانچہ اس نئی قیادت کی کامیاب جدوجہد کے لیے تین چیزیں ازبس ضروری خیال کی ہیں۔

(۱) ایک ایسا خیال انگیز نصب العین اور معاشرت، سیاست اور معیشت کا ایسا ہمہ گیر نظام جو سیلاب بن کر اُمڈ پڑے اور مذہب اور مذہبی روایات کو پوری قوّت کے ساتھ اپنے ساتھ بہا لے جائے اور مغربی تہذیب کی نشوونما کے لیے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ زمین ہموار کر دے۔

(۲) اس نئی قیادت کا مزاج سراسر آمرانہ ہو اور وہ قوم پر نہایت سخت قسم کی آمریّت مسلّط کرے اور اپنے انقلاب انگیز عزائم کی تکمیل میں رائے عامہ کو قطعاً درخورِ اعتناء نہ سمجھے بلکہ اگر کسی گوشے سے بھی اختلاف کی معمولی آواز بھی بلند ہو تو اُسے سختی سے دبا دے۔

(۳) یہ قیادت انقلاب کے لیے تشدّد پر کامل ایمان رکھتی ہو اور قوم سے ہر بات جبر کے ساتھ منوانے کے لیے تیار ہو۔ جو لوگ اس کے انقلابی پروگرام کا ساتھ دینے میں ذرا سُست رفتاری کا ثبوت دیں اُنھیں بلا تامّل نیست و نابود کر دے۔

مسٹر سنیائے کے تجزیہ کے مطابق یہ کام صرف اشتراکیت کے ہاتھوں ہی بڑی خوبی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے اور صرف کامریڈوں کے جتھے انقلابی قیادت کی ضرورت کو پورا کرنے کی اہلیّت رکھتے ہیں۔ فاضل مصنّف کے قول کے مطابق اشتراکیّت ایک ایسا انقلاب انگیز نصب العین ہے جو طوفان بن کر اُٹھتا ہے اور مذہب اور اس کی روایات کو چشم زدن میں تاراج کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوسرے اشتراکیت آمریّت کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی مُنہ زور ہوتی ہے اور اس کی بے حس جکڑ بندیاں اشتراکیّت کے علمبرداروں کو دین اور اخلاق برباد کرنے کی کھلی چھٹی مہیّا کرتی ہیں اور اُنھیں اس بات کے مواقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کی راہ میں مزاحم ہوں اذیّت ناک عذاب دے کر موت کے گھاٹ اُتار دے۔ مادیّت، آمریّت اور تشدّد یہ وہ تثلیث ہے جس پر ہر اشتراکی پورا پورا

ایمان رکھتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کا انکار اشتراکی شریعت میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔

اس ضمن میں سنیائے صاحب کا استدلال ملاحظہ فرمائیں:

"دورِ جدید میں اشتمالیت بیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ انقلاب کا نہایت اچھا نعم البدل ہے جو بد قسمتی سے روایت پرست معاشروں میں کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جا سکا۔ یہ نظام بلاشبہ متشددانہ اور کلیّت پسندانہ ہے مگر پس ماندہ معاشروں کو صنعتی اور جدید بنانے اور معاشی، تعلیمی اور سائنسی میدانوں میں اُنھیں مغرب زدہ بنانے کے لیے یہ نہایت ہی کارگر ہتھیار ہے اور پھر چونکہ اس میں کسی معاشرت کی گہری روایات کے انکار کا بھی حوصلہ ہوتا ہے اس لیے کسی نئے صنعتی معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے اس سے بے پناہ قوّت مہیا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ نظام اپنی وحشیانہ طاقت کے بل بوتے پر پوری قوم کو کام پر لگا سکتا اور معاشرے کو زیر و زبر کر سکتا ہے اور وحشیانہ بے حسی کے ساتھ ہر جماعت اور طبقے کے دعوے کو نظر انداز کر سکتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو۔ پھر اس نظام کو برپا کرنے میں لوگوں پر جو مصائب آئیں یا وہ جن شدائد سے دوچار ہوں سوشلزم ان کے بارے میں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔

"اشتمالیت نے خود آگے بڑھ کر ایک ایسی "مملکتی سرمایہ داری" یا نوکر شاہی کو جنم دیا ہے جو کسی صنعتی معیشت کا نقشہ تیار کرنے، اسے کامیابی کے ساتھ چلانے اور اس کا بہتر طور پر انتظام و انصرام کرنے کے لیے انسانوں کے اندر مغربی صفات اور خو بیاں پیدا کرتی ہے۔

مملکتی سرمایہ داری کی تشکیل اشتمالیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے:

مسلمانوں، بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ سنیائے صاحب کی ان

نصرنجات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں اصل کے اعتبار سے کچھ بھی فرق ہے اور کیا اشتراکیت کا مقصد مغرب کی اسی مادّی تہذیب کو فروغ دینا نہیں ہے جسے سرمایہ داری اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھی ہے؟ ان کے مابین اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ جس نحوست کو سرمایہ داری آہستہ آہستہ لاتی ہے اسے اشتراکیت یکبار قوّت کے زور سے آناً فاناً مسلّط کر دیتی ہے۔ سرمایہ داری جس مفسدانہ و مہلکانہ عمل کا آغاز کرتی ہے، اشتراکیت اُسے نہایت سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

تصانیفِ صدّیقی

[illegible] سے غور کریں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں [illegible] حیثیت سے کچھ بھی فرق ہے اور کیا اشتراکیت [illegible] نہیں ہے جیسے سرمایہ داری [illegible] اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ جس [illegible] اشتراکیت یکبارگی قوت کے زور سے [illegible] سرمایہ داری جس [illegible] کا آغاز کرتی ہے اشتراکیت اسے [illegible] کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

تمت بفضلہ تعالیٰ

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کی تصانیف

برادرِ محترم جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم ایک اسلام پسند مفکر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ اُن کے دل و دماغ کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں خدمتِ دین کے لیے وقف تھیں اور یہ اتنا بڑا شرف ہے جس کے آگے تمام کمالات و فضائل ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ کتنی بڑی سعادت ہے جو مرحوم کو میسّر آئی کہ اقامتِ دین اُن کی تمام تر جدوجہد کا مقصود و مطلوب بن گیا۔

مرحوم کے افکار مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی فکر سے کافی حد تک متاثر ہیں۔ اس لیے اُن کے اندازِ بیان میں سلجھاؤ اور استدلال میں قوّت پائی جاتی ہے۔ ایسی قوت جس کا کام مرعوب کرنا نہیں بلکہ دل و دماغ کو مطمئن کرنا ہے۔ اُن کی تحریر سے خلوص و یقین کی روشنی چھنتی نظر آتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے بارے میں وہ "معذرت آمیز" رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ ہر محاذ پر اس عزیمت کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں کہ اسلام اور صرف اسلام ہی دین حق ہے اور اسی کو غالب ہونا چاہیئے۔

مرحوم ایک طویل عرصہ تک اپنے قلم کے ذریعے دینی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا اُن پر خاص فضل و کرم تھا کہ اُن کے ذہن و فکر کی صلاحیتیں اور دل و دماغ کی ساری قوتیں کتاب و سنت اور خیر و اخلاق کی تبلیغ و تذکیر میں صرف ہوتی رہیں۔

مرحوم اس اعتبار سے ممتاز شخصیت کے حامل تھے کہ پاک و ہند کے سب سے بڑے دینی ماہنامے "ترجمان القرآن" کا اداریہ برسوں سے وہ لکھ رہے

تھے جو صاحب موصوف کی دینی بصیرت کی زندہ شہادت ہے۔

مرحوم اسلامیات کے مشہور اسکالر تھے۔ عربی زبان اور انگریزی انشاء پر قابلِ رشک حد تک دسترس رکھتے تھے۔ ذیل میں مرحوم کے قلم سے لکھی گئی تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے جو کہ مختلف رسائل اور اخبارات میں آپ کی کتابوں پر کیے گئے تبصروں سے ماخوذ ہے:

انگریزی کتب

1. THE LIFE OF MUHAMMAD

(ضخامت 324 صفحات)

جذبۂ صدق وصفا کی تخلیق دو عظیم ماخذوں کے ذریعے ہو سکتی ہے اور وہ ماخذ، قرآن مجید اور سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ ہیں۔ ہمارے مسائل اگرچہ روز بروز پیچیدہ ہو رہے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ قرآن مجید کی روشنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ان سب کا حل موجود ہے۔ اس لیے بزرگانِ دین یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمارے تعلیمی نصاب کو اسلامی رنگ دیا جائے نیز ملکی قوانین وضع کرنے میں اسلامی اساس کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس ضرورت کے تحت ان عظیم ماخذوں کا گہرا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

زمانہ حاضر اور مستقبل کے انہی تقاضوں کے پیشِ نظر جناب پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے THE LIFE OF MUHAMMAD کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب سلیس اور فصیح انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ اس میں واقعاتی تسلسل کو اگرچہ قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بعض واقعات یکجا طور پر بھی پیش کیے گئے ہیں تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی مجموعی تصویر سامنے آ سکے۔ بعض ضروری مواقع پر مستشرقین کے منفی تبصروں پر تفصیلی بحث کر کے دلائل و براہین سے ان کی تردید کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ

سے متعلق یہ کتاب انگریزی خواں طبقے اور خصوصاً اُن نوجوانوں کے لیے جو شک و گماں میں مبتلا ہیں ازبس مفید ہے۔

2. PROPHETHOOD IN ISLAM

(ضخامت 150 صفحات)

اس کتاب کو دراصل مصنّف کی کتاب The Life of Muhmamad کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے۔ اس میں نوعِ انسان کے لیے پیغمبر کی ضرورت، نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور ختمِ نبوت ایسے عظیم مسائل کی بڑے فاضلانہ طریقے سے وضاحت کی گئی ہے۔

فاضل مصنّف نے کتاب کے پہلے دو ابواب میں بنی نوع انسان کے لیے نبی کی ضرورت اور حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت پر نہایت مؤثر اور فاضلانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے جس سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات جن کی بدولت عالمگیر مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی انقلاب پیدا ہوا، سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ آخری باب مسئلۂ ختمِ نبوت پر ہے۔ اس مسئلے کو فاضل مصنّف نے قرآن وحدیث کی روشنی میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

PROPHETHOOD IN ISLAM خلوصِ عقیدہ اور احترامِ محبت کی آئینہ دار ہے جو مصنّف کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ تھا۔

3. A PHILOSOPHICAL INTERPRETATION OF HISTORY

(ضخامت 184 صفحات)

نوعِ انسانی کے حافظے کو ماؤف کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ اسپنگلر اور اس کے متبعین کی حیاتیاتی توجیہہ اور ہیگل، مارکس اور ان کے ہم نواؤں کی مادی تعبیر کا ہے۔ تاریخ کی یہ تعبیریں دورِ جدید کے وہ زبردست فتنے ہیں جنہوں نے تعلیم یافتہ طبقہ کے افکار و خیالات پر بُری طرح تسلط حاصل کر لیا ہے۔

چنانچہ بہت کم ہی لوگوں کو اس کی توفیق ہوتی ہے کہ تاریخ کے اتار چڑھاؤ کا صحیح جائزہ لیں۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے ان کے باطل نظریات وافکار پر سلجھے ہوئے انداز سے تنقید کرکے اُن کے بودے پن اور سطحیت کو نمایاں کیا ہے اور آخر میں وضاحت سے تاریخ کی صحیح تعبیر پیش کی ہے۔ یہ تصنیف انگریزی میں اس مبحث پر قابلِ قدر اضافہ ہے۔

4. ISLAM AND THE REMAKING OF HUMANITY

(ضخامت 248 صفحات)

اس کتاب کے ابواب کی فہرست ہی سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تہذیبِ الحاد کے اجزائے ترکیبی —— معاشرتی ارتقاء کا تصور —— سرمایہ دارانہ جمہوریت —— سرمایہ دارانہ جمہوریت کا معاشی پہلو —— اشتراکیت کے اساسی تصورات —— اشتراکیت کی فکری لغزشیں —— اشتراکیت میدان عمل میں —— فسطائیت اور اس کی ستم رانیاں —— مادی تہذیب کی تنگ دامانیاں اور انسانیت کی تعمیرِ نو کے لیے مسلمان مصلحین کو دعوت۔

یہ کتاب جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم کی وہ فکر انگیز تالیف ہے جس میں اُنھوں نے سرمایہ داری، اشتراکیت اور فسطائیت کے علمبردار نظامہائے زندگی کا بہ نظر عمیق جائزہ لیا ہے اور نوعِ انسانی پر ان کے تباہ کن اثرات نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ انسانیت کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں اسلام کے کردار کو واضح کیا ہے اور ٹھوس دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ہر زمانے کی طرح موجودہ دور میں بھی صرف اسلام ہی نوعِ انسانی کے تمام فطری تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور پیش آمدہ مسائلِ حیات کا صحیح حل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آخر میں تعمیرِ انسانیت کے اس عظیم کام کی سرانجام دہی کے لیے

فاضل مصنّف مسلمان مصلحین کو میدان عمل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔
فاضل مصنّف کے مطالعہ کی وسعت اور محنت و کاوش کا اندازہ کتاب کے آخر میں دی گئی فہرست ماخذ سے ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل انھوں نے بے شمار اُردو و انگریزی کتب کا مطالعہ کیا اور ان کتابوں کے جوہر، خلاصے اور روح سے اپنی کتاب میں کام لیا ہے۔

5. MAIN SPRINGS OF WESTERN CIVILIZATION

(ضخامت 159 صفحات)

اس کتاب میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے مغربی تہذیب کے سرچشموں پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے: یونانی میراث ــــ رومن تہذیب ــــ عیسائیت اور یورپ پر اس کے اثرات ــــ اسلام کا عروج اور مغربی تہذیب میں اس کا حصّہ ــــ نشاۃ الثانیہ ــــ دورِ اصلاح اور اصلاحی تحریکیں۔

مغربی تہذیب نے بلاشبہ جدید دور کے انسان کو زندگی کی بعض مادی آسائشات مہیّا کی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اُس کا ذہنی سکون بھی چھین لیا ہے۔ مسلمان مادی لحاظ سے چاہے کتنے ہی پسماندہ کیوں نہ ہوں جب تک اسلامی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے دُنیا میں سُرخرو اور سرفراز ہی رہیں گے۔

6. THEOCRACY AND THE ISLAMIC STATE

(ضخامت 32 صفحات)

اس کتاب میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ مغرب زدہ طبقہ "اسلامی ریاست" پر جو "مذہبی حکومت" کی طنز کرتا ہے وہ نہایت ہی غیر دانشمندی کی بات ہے اور اُن کی اس طنز میں علمی اور عقلی اعتبار سے کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ مذہبی حکومت اور اسلامی ریاست میں نام کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہیں ہے اور یہ لفظی اشتراک بھی صرف اس مجبوری کے سبب

ہے کہ انگریزی زبان میں "خلافت" کا مترادف کوئی لفظ نہیں ملتا۔ یہ دنوں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ مگر مقامِ افسوس ہے کہ ان بنیادی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی اسلامی ریاست کو مذہبی حکومت کے ساتھ الجھایا جاتا ہے اور پوری قوت کے ساتھ اس راگ کو الاپا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ اُلجھی ہوئی گفتگو، سیاسی قابلیت کی دلیل نہیں ہے۔

اس کتاب میں موصوف نے "اسلامی ریاست" اور "مذہبی حکومت" کے مابین پائے جانے والے فرق کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

7. WHAT ISLAM GAVE TO HUMANITY

(ضخامت 35 صفحات)

اسلام بنی نوعِ انسان کے لیے ایک منصفانہ اور مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے۔ اگر ایک طرف یہ روحانی اور اخلاقی اقدار پہ زور دیتا ہے تو دوسری طرف زندگی کے مادی پہلو سے بھی انکاری نہیں۔ بلاشبہ اسلام روحانی اور مادی اقدار کا متوازن مجموعہ ہے۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم اسلامیات کے بہت بڑے اسکالر تھے اور یہ کتاب اُن کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

8. JIHAD IN ISLAM

(ضخامت 44 صفحات)

اس کتاب میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں جہاد کی اہمیت بیان کی ہے اور اُن تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے جو کہ اہلِ مغرب میں جہاد کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔

9. WHAT AGITATES THE MIND.OF THE EAST?

(ضخامت ۳۲ صفحات)

اس کتاب میں مسٹر ہیون کے اس باطل نظریہ کہ "مذہبی لوگ اپنی قوم کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں" کو ناقابلِ تردید شواہد سے ردّ کیا گیا ہے۔

اُردو کتب

۱۔ اسلام کا فلسفۂ تاریخ
(ضخامت ۱۳۳ صفحات)

اس کتاب میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت فاضلانہ بحث کی ہے۔ (۱) تاریخ کا حیاتیاتی نظریہ (۲) تاریخ کی مادی تعبیر اور (۳) اسلام کا فلسفۂ تاریخ۔

یہ کتاب ایک مردِ مومن کی فراست اور فہم و دانش کی اصابت کی گواہی دیتی ہے کہ جو آنکھیں کتاب و سنت کے سُرمہ سے روشن ہوں اُن میں نہ تو تہذیب و تمدن کی برقپاشیاں چکاچوند پیدا کرتی ہیں اور نہ مادیت کے اندھیروں میں اُسے ٹھوکریں لگتی ہیں۔ اس کتاب میں تاریخ کے حیاتیاتی اور مادی فلسفوں کی تشریح و توضیح کے ساتھ ساتھ اُن کی فکری لغزشوں کی نشاندہی کر کے اسلامی فلسفۂ تاریخ کے ساتھ اُن کا تقابل کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ڈارون، کارل مارکس اور اسپنگلر کے افکار و نظریات کو عقلی استدلال کے ساتھ بڑے پُر زور طریقے سے ردّ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنّف نے بتایا ہے کہ یہ خدا ناشناس تمدن جس پر آج دنیا فخر کر رہی ہے، نیکی، صداقت، راست بازی اور انسانیت کی ضد ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جاہلیت پتھروں اور تیروں سے جنگ کرتی تھی اور آج ایٹم بموں اور کاسمک ریز کو انسانوں کی ہلاکت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنس اور تمدن کی ترقی نے آدمی کی شقاوت کو پہلے کی نسبت کچھ اور بڑھا دیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر اسلام کی حقانیت اور اس کے اصول و ضوابط کا انسانیت کے لیے مفید بلکہ ناگزیر ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے اور مادی تہذیب کی ساری چمک دمک نگاہوں سے گر جاتی ہے۔

۲۔ مذہب اور تجدید مذہب
(ضخامت ۲۱۸ صفحات)

مصنّف کی یہ کتاب اُن کی زندگی کے آخری دنوں کی یادگار ہے۔ یہ اُن کی زندگی کا وہ دور تھا جب وہ علم و فکر کی بے شمار منزلیں طے کرنے کے بعد ایک ایسے مقام پر پہنچ چکے تھے جو اُن کی فکری اور ذہنی پختگی کی معراج تھی۔ اس لحاظ سے مصنّف کی دیگر درجنوں تصنیفات میں اس کتاب کی اہمیّت امتیازی ہے۔

زندگی رواں دواں ہے اور ہر روز جو آفتاب دنیا پر طلوع ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کچھ نئے مسائل لاتا ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون ہوتا تو تجدید مذہب کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن زمانے کے ہر آن بدلتے ہوئے تقاضے مذہب کے علمبرداروں سے ہر لمحہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ نئے اُبھرنے والے مسائل کو مذہب کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

بعض لوگوں نے غلطی سے تجدید کو تجدد کا ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ اُن کے نزدیک تجدید کا کام اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ دین کے اندر ایسی نئی نئی باتیں نہ پیدا کی جائیں جن کا نہ تو پہلے کوئی نام و نشان ملتا ہو اور نہ اُس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہوں۔ مجدّدِ دین کا انداز تجدد پسندوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ مجدّد دین کے اندر کوئی نئی طرح نہیں ڈالتے بلکہ دین کی پُرانی روایات اور تعلیمات کو وقت کے تحت نئے طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

مرحوم نے اس کتاب میں مذہب کے مقصد و منہاج، اُس کے مزاج اور اس کے تاریخی ارتقاء پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد اس کی تجدید کے نازک فرض کو سرانجام دینے کے اصول و ضوابط بیان کیے ہیں۔

۳۔ انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام

(ضخامت ۲۲۲ صفحات)

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم علمی و دینی حلقوں کے جانے پہچانے قلمکار تھے، ان کے قلم سے ہزاروں صفحات نکل چکے ہیں اور ان کے فکر و نظر نے سوچنے کی راہیں متعین کی ہیں۔ جناب صدیقی مرحوم کی اہم تالیفات میں سے ایک "انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام" ہے۔

زیرِ نظر تالیف کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کے دو ہی نظام ہیں، ایک وہ جسے حسیت کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرا اسلام۔ اشتراکیت، سرمایہ دارانہ جمہوریت اور فسطائیت حسیت کے مختلف روپ ہیں۔ جناب صدیقی مرحوم نے مغربی تہذیب و تمدن اور افکار کا تجزیہ کرتے ہوئے مغربی اہلِ فکر سے استشہاد کیا ہے اور اس تہذیب کے ثمرات پر گفتگو کی ہے۔

۴۔ ایمان اور اخلاق

(ضخامت ۲۴۵ صفحات)

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم تقریباً ۲۶ سال تک ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے اداریے "اشارات" کے عنوان سے لکھتے رہے۔ ان "اشارات" کا مرکزی موضوع ایک ہی رہا اور وہ ہے انسان کا روحانی اور اخلاقی احساس۔ یہی وہ احساس ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔

یہ کتاب مرحوم کے قلم سے لکھے گئے "اشارات" میں سے اخذ کردہ ایک ہی نوعیت کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ انسان جب اپنے روحانی احساس کی آبیاری تعلیماتِ الٰہیہ سے کرتا ہے تو وہ کس صورت میں اور کن صفات و خصوصیات کے ساتھ برومند ہوتا ہے اور حیاتِ انسانی پر کس قسم کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۵۔ عقیدۂ ختمِ نبوت کے چند عمرانی پہلو

(ضخامت ۶۴ صفحات)

دینِ اسلام میں عقیدۂ ختمِ نبوت محض ایک مابعد الطبیعی تصوّر کی حیثیت سے شامل نہیں بلکہ اسلامی تہذیب و تمدّن کی تشکیل میں اُس نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کتاب میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضور سرورِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نبی آخر الزماں ہونے کے تصوّر نے تہذیبِ اسلامی کی تشکیل میں کیا حصّہ لیا ہے۔ مرحوم کے نزدیک یہی وہ عقیدہ ہے جس نے مسلمانوں کے سامنے قیامت تک ایک پیکرِ محسوس کی شکل میں واحد معیارِ حق پیش کیا، انھیں رشد و ہدایت کی معروضی قدریں عطا کیں، اُن کے باہم اجزا کو ایک اُمّت بنایا، اُن میں خود اعتمادی پیدا کی اور عقل و فکر سے خود کام لینا سکھایا، عالمِ اخلاق میں زمان و مکان کی ساری حد بندیوں کو ختم کیا اور ملّتِ اسلامیہ میں ہر قسم کے نسلی، نسبی اور قومی امتیازات کو مٹا کر معاشرہ میں ایک صحیح قسم کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی مساوات کی داغ بیل ڈالی۔

۶۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ غرب

(ضخامت ۳۲ صفحات)

مغرب زدہ طبقے اسلام کو محض روحانی اور اخلاقی اقدار کا بے جان مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مبلغین اور مقلدینِ اسلام ایسے "مذہبی دیوانے" ہیں جو اپنی قوم کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے اپنی اس کتاب میں اس باطل نظریہ کو بڑے ناقابلِ تردید شواہد سے ردّ کیا ہے۔

۷۔ اسلام اور تھیا کریسی

(ضخامت ۳۲ صفحات)

یہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کی انگریزی کتاب THEOCRACY AND THE ISLAMIC STATE کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا کام بھی مرحوم نے خود ہی سرانجام دیا ہے۔

انگریزی تراجم

1. THE HOLY QUR'ĀN

(قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ اور تشریحی تعلیقات)

(نو پارے)

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی علمی زندگی کو اس جلیل القدر مقصد کے لیے وقف کر رکھا تھا کہ قرآن و سُنت کی روح اور تقاضوں کو انگریزی زبان میں اس انداز سے منتقل کر دیا جائے کہ جس سے مغربی دنیا کو اُن علوم و معارف سے استفادہ و آشنائی کا موقع فراہم ہو جو براہِ راست عربی زبان کی وسعتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک عرصے سے محروم چلی آرہی ہے۔

عرصہ دراز سے اس امر کی اشد ضرورت تھی کہ قرآن مجید کو سنتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے قرآن مجید کا ترجمہ کر کے اس ضرورت کو پُورا کرنے کی کوشش کی۔ مگر افسوس کہ وہ ابھی بارہ پاروں کا ہی ترجمہ کر پائے تھے کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ترجمہ کے بارے میں ہماری جچی تُلی رائے یہ ہے کہ اس سے کسی بھی زبان کی اصلی و حقیقی خوبیوں کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر زبان کا اسلوبِ اظہار، مزاج اور دلالت و ترجمانی کا انداز اپنا ہوتا ہے جس کو بعینہٖ کسی بھی دوسری زبان میں

بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا کریگا، اُسے دو باتوں میں سے ایک کو بہرحال اختیار کرنا پڑے گا۔ یا تو وہ اس چیز کا اہتمام کرے گا کہ اصل زبان کی صرف و نحو اور اسلوبِ اظہار کا پورا پورا خیال رکھے اور یا اس کی کوشش اس ڈھنگ کی ہوگی کہ جس زبان میں ترجمہ ہو رہا ہے اس کے مزاج، خصوصیات اور تیور نسبتاً زیادہ ملحوظ خاطر رہیں۔ جناب صدیقی مرحوم کا تعلق اوّل الذکر انداز سے ہے۔ اُنھوں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں عربی زبان کے صرفی و نحوی تقاضے مجروح نہ ہونے پائیں اور یہی ان کے ترجمہ کی اہم خصوصیت ہے۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے ترجمہ و تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم رکھا ہے۔ ان کے ترجمہ پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تشریحی حواشی میں حدیث کو بنیادی اہمیت دی ہے اور اگر کسی معاملے میں اُنھیں حدیثِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نہیں مل سکی تو اُن مفسرین کرام پر اعتماد کیا ہے جنھوں نے اسلامی علوم کی تحصیل اور تفہیم میں عمریں صرف کی ہیں۔

ترجمۂ قرآن میں اُنھوں نے کس قدر محنت کی ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ فہرست ماخذ اور حواشی میں دیئے گئے حوالوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر سترہ عربی تفاسیر، ۱۲ اردو اور فارسی تراجم و تفاسیر، دس انگریزی تراجم اور اُنیس اہم کتب حدیث رہی ہیں۔

2. SAHIH MUSLIM

(ضخامت 1664 صفحات جو کہ چار جلدوں پر مشتمل ہیں)

صحیح مسلم کا شمار احادیث کی اُن چھ کتابوں میں ہوتا ہے جو مستند ترین سمجھی جاتی ہیں۔ عصرِ حاضر کی یہ شدید ضرورت ہے کہ احادیثِ نبویؐ کے مستند مجموعے خصوصاً صحاح ستہ کو انگریزی اور دوسری زبانوں میں ڈھالا جائے تاکہ قرآن کریم

کو سمجھنے کے لیے نو مسلم اور انگریزی داں تعلیم یافتہ طبقہ ان سے خاطر خواہ استفادہ کر سکے۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے صحاح ستہ کے مشہور مجموعہ احادیث "صحیح مسلم" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ صحیح، چُست، مطلب خیز اور رواں ہے۔ ادبی محاسن قائم رکھتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ اصل مفہوم سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو۔

فاضل مترجم نے یہ بڑا اچھا کیا ہے کہ حواشی میں فقہی و کلامی مباحث کو طول دینے کے بجائے زیادہ تر حدیث کے عملی فوائد پر زور دیا ہے اور حدیث کے وہ پہلو اجاگر کیے ہیں جن سے ایمان و یقین میں اضافہ اور جذبۂ عمل میں ترقی ہو اور جن سے زندگی کے روزمرّہ کے مسائل میں راہنمائی ملتی ہے۔ حواشی اس لحاظ سے بڑے قابلِ تعریف ہیں کہ ان میں اختصار کے ساتھ ضروری باتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں دس صفحات کا ایک فکر انگیز تعارف ہے جس میں پیغمبر آخرالزماں صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی حیثیت، حدیث کی اہمیّت و حُجیّت، تنقیدِ متن و اسناد کی بحث، امام مسلم کے حالاتِ زندگی، ان کی الجامع الصحیح کے امتیازی خصائص اور چند ایک مصطلحاتِ حدیث کی تعریفات ملتی ہیں۔

انگریزی داں طبقہ کے لیے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے کیونکہ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے فرمائے ہوئے "جوامع الکلم" انسانیت کے لیے حیات آفرین منشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حکمت و بصیرت کے یہ وہ گہر ہائے آبدار ہیں جن کی چمک دمک کبھی کم نہیں ہو سکتی۔

3. MISHKAT-UL-MASĀBIH

(ضخامت جلد اوّل: 288 صفحات)

(" جلد دوم: ۳۰۶ ")

یہ حدیث کی مشہور کتاب "مشکواۃ المصابیح" کا انگریزی ترجمہ ہے جس کی دو

جلدیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں اور باقی زیرِ طبع ہیں۔

ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے براہ راست عربی متن سے اسے انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت جناب صدیقی مرحوم کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ احادیث کے عربی متن کا انگریزی میں لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے ان کے مطالب و معانی انگریزی داں طبقہ تک پہنچائیں اور جہاں تک ممکن ہو ترجمہ اصل مفہوم سے مکمل طور پر ہم آہنگ رہے۔ چنانچہ اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

4. PRAYERS OF THE PROPHET— MASNUN DU'A'AIN

(ضخامت 71 صفحات)

یہ کتاب مسنون دعاؤں کے انگریزی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ ترجمہ سادہ، سلیس اور عام فہم ہے جس سے انگریزی خواں طبقہ کماحقہ استفادہ کر سکتا ہے۔

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بہت سے دعائیں منسوب ہیں جن کے ذریعے آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب فرماتے تھے اور آپؐ نے مسلمانوں کو بھی یہ دعائیں پڑھنے کی تلقین فرمائی۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم دعاؤں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس کتاب کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

"مادہ پرستی کے اس دور میں مسنون دعاؤں پر مبنی کتاب ممکن ہے بظاہر زیادہ کشش نہ رکھتی ہو۔ جدید دور کا انسان مادی دوڑ دھوپ میں اس قدر منہمک ہے کہ اس کے پاس روح کی تسکین کے لیے سامان مہیا کرنے کا وقت ہی نہیں۔ مگر اس کشمکش میں وہ بعض اوقات اپنی زندگی میں ایک وسیع خلاء محسوس کرتا ہے اور اس کی روح روحانی تسکین کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ یہ ایسا موقع ہے

جب انسان دعاؤں میں آرام اور سکون پاتا ہے۔

"دعا انسان کی زندگی اور روح ہے۔ یہ انسان کی وہ فطری ضرورت ہے جس کو اس سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی دنیا میں جب انسان مادہ پرستی کے جنگل میں گرفتار ہے اور اسے روحانیت سے عاری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے، دعاؤں کی ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔"

5. AL-HIZB AL-A'ZAM

(ضخامت 116 صفحات)

یہ کتاب قرآن مجید اور احادیث نبوی سے منتخب کردہ دعاؤں کا مجموعہ ہے جس کا پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے جس سے انگریزی داں طبقہ استفادہ کر سکتا ہے۔ یہ مجموعہ سات ابواب پر اس طرح مشتمل ہے کہ ہر باب ہفتے کے ہر دن کے لیے مختص ہے۔ چنانچہ یہ کتاب پورے ہفتے کے لیے یادِ الٰہی کا ایک بہترین اور مقدس لائحہ عمل ہے۔

اُردو تراجم

۱۔ انگریزی نظامِ تعلیم کا اساسی تخیّل

(ضخامت ۲، صفحات)

تعلیم سے متعلق افراد میں ہمارے ہاں میکالے کا نام جتنا معروف ہے شاید ہی کسی کا ہو۔ لیکن بہت کم لوگوں نے براہِ راست اس یادداشت کو پڑھا ہو گا جس کی بنیاد پر انگریزوں نے ہندوستان کے لیے وہ نظامِ تعلیم رائج کیا جس کو ہم آج تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے لارڈ میکالے کی اس تاریخی یادداشت کو نہ صرف اُردو میں ترجمہ کر کے اس تک ہر

شخص کی رسائی ممکن بنادی ہے بلکہ ساتھ ہی تنقیدی حواشی لکھ کر اس کی اصل حقیقت بھی واضح کر دی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ بھی سپردِ قلم کیا ہے جس میں فاضل مترجم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ انگریزوں نے نظامِ تعلیم کو مسلمانوں کو ان کے ایمان سے برگشتہ کرنے اور اپنی تہذیب کا نمونہ بنانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد قاری پر برطانوی سامراج کے وہ تمام عزائم اور مقاصد آشکار ہو جاتے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر اُس نے ہمارے لیے وہ نظامِ تعلیم تجویز کیا تھا جسے ہم آج بھی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پڑھنے والے کے دل میں یہ احساس بھی شدّت اختیار کر جاتا ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کو اساسی طور پر نظریہ اسلام کے مطابق ڈھالنے کی کس قدر فوری اور شدید ضرورت ہے اور یہ تبدیلی نہ ہونے سے ہم سامراج کے مقاصد کی کس حد تک تکمیل کر رہے ہیں۔

طالب علموں، اساتذہ، ماہرینِ تعلیم اور اس کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے یہ کتاب بہت مفید اور معلومات افزا ہے۔

۲۔ اسلام کا روشن مستقبل
(ضخامت ۱۳۲ صفحات)

یہ کتاب سیّد قطب شہید کی عربی تالیف "المستقبل لہذا الدین" کا اُردو ترجمہ و تلخیص ہے۔ سیّد قطب شہید رحمتہ اللہ علیہ دنیائے اسلام کے وہ بطلِ جلیل ہیں جنھوں نے اسلام کی "شہادت گہِ اُلفت" میں اس شان سے قدم رکھا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اسلام سے اُن کی لازوال محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ اپنا سرمایۂ جسم و جان اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔

ان کی اس تصنیف میں ان کی اسلام کے ساتھ گہری محبت، اس کی تعلیمات پر یقین کامل پوری طرح نمایاں ہے۔ نیز اسلام کے ساتھ محبت کی جو چنگاری

فاضل مصنّف کی اس کتاب میں فروزاں ہے اس سے تمام اہلِ شوق اپنے دلوں کو گرما بھی سکتے ہیں اور انھیں روشن بھی کر سکتے ہیں۔

ترجمہ کی زبان نہایت آسان، سلیس اور عام فہم ہے۔

۳۔ ایمان اور زندگی

(ضخامت ۱۸۷ صفحات)

یہ کتاب دنیائے عرب کے نامور مصنف جناب علامہ یوسف القرضاوی مرحوم کی عربی تالیف "الایمان والحیواۃ" کا اردو ترجمہ و تلخیص ہے۔

۴۔ اسلام اور معاشی تحفظ

(ضخامت ۱۷۰ صفحات)

یہ کتاب عالم اسلام کی مشہور علمی شخصیت جناب علامہ یوسف القرضاوی مرحوم کی عربی کتاب "مشکلۃ الفقر وکیف عالجھا الاسلام" کا اردو قالب ہے۔

۵۔ خدا موجود ہے

یہ انگریزی کی مشہور کتاب EVIDENCE OF GOD کا اردو ترجمہ اور تلخیص ہے۔

۶۔ صحیح مسلم

(پارہ اوّل)

"صحیح مسلم" کے انگریزی ترجمہ کی اندرون و بیرون ملک اسقدر پذیرائی ہوئی کہ مرحوم نے انگریزی نہ جاننے والے حضرات کے اصرار پر "صحیح مسلم" کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا مگر افسوس کہ ابھی وہ بمشکل دو تین پاروں کا ترجمہ ہی مکمل کر پائے تھے کہ خالقِ حقیقی کا بلاوا آگیا۔ اُن کی وفات کے بعد اسکا صرف ایک پارہ ہی چھپ سکا ہے۔

۷۔ ریاض الصالحین

مرحوم اپنی زندگی میں "ریاض الصالحین" کا اردو میں ترجمہ کر گئے تھے مگر تاحال

یہ نہیں چھپ سکا باوجودیکہ اُن کو وفات پائے بھی تقریباً دو سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔

۸۔ قوت حافظہ

مرحوم کی یہ کتاب تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔

عربی تراجم

تعبیر التاریخ

یہ کتاب پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کی مشہور انگریزی کتاب

A PHILOSOPHICAL INTERPRETATION OF HISTORY

کا عربی ترجمہ ہے۔ ترجمہ جناب کاظم الجاوادی نے کیا ہے اور اس کی طباعت کویت میں ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا طبع شدہ کتب کے علاوہ مرحوم نے اپنے پیچھے اپنی تحریروں کا ایک گنج گرانمایہ چھوڑا ہے۔ اس میں سے چند ایک کتابوں کے مکمل مسودات بھی ملے ہیں جن کو چھاپنے کا اہتمام ادارہ "قاضی پبلیکیشنز" کر رہا ہے۔ چنانچہ مرحوم کی درج ذیل انگریزی و اُردو کتب زیر طبع ہیں:

1- SELECTION FROM QUR'AN AND AHADITH

2- THE ISLAMIC CONCEPT OF HISTORY

3- THE IDEOLOGICAL CONFLICT OF MANKIND

4- RELIGION AND THE REVIVAL OF RELIGION

5- نبوت اور ختم نبوت

6- سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

7- مسئلہ تحدیدِ نسل اور اسلام

علاوہ ازیں ادارہ "قاضی پبلکیشنز" اس بات کا بھی اہتمام کر رہا ہے کہ ملک کے نامور اہلِ قلم حضرات کا تعاون حاصل کر کے مرحوم کے نامکمل مسودات کو مکمل کروایا جائے۔ نیز اُن کے بکھرے ہوئے سینکڑوں مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل دی جائے تاکہ مرحوم کے اس صدقہ جاریہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہوں۔

(محمد اقبال صدیقی)

پروفیسرؒ عبدالحمید صدّیقیؒ کی یاد میں

زندگی عارضی سی پائی ہے
موت اِک لمحۂ جدائی ہے

دوستوں کے لیے قیامت ہے
غمِ جاناں تیری دہائی ہے

زندگی کر گئے سلیقے سے
نوحہ گراں کی اِک خدائی ہے

زندگی کا چراغ گُل کر کے
جاودانی حیات پائی ہے

رُوح تیری تھی مضطرب ہر دم
آج تسکین اس نے پائی ہے

کلمۂ حق کی سربلندی کو
زندگی تیری راس آئی ہے

قید تھی زندگی تیری مومن
موت پیغامِ وصل لائی ہے

موت کا غم تیری بلا کرتی
بندِ غم سے نجات پائی ہے

عہد و پیمانِ زیست توڑ دیا
دوستوں سے یہ بے وفائی ہے

ہم کو محرومِ دید کر کے بھی
تم کو دعوائے نارسائی ہے

سفرِ آخرت میں یہ عجلت
بیوفائی سی بیوفائی ہے

کل تلک تم رہے سفر میں مگر
آج عذرِ شکستہ پائی ہے

رُوٹھ کر جا رہا ہے اپنا حمید
سخت دشوار یہ جُدائی ہے

تاکہ ہو جاؤ زندۂ جاوید
اس لیے موت تم کو آئی ہے

(پروفیسر اسرار احمد سہاروی)

OUR PUBLICATIONS

1. Sahih al-Bukhari, Volumes, I, II, III (Each Vol.)
2. Arabic for the Beginners
3. Guide for Hajj and 'Umra
4. Islam and the Remaking of Humanity P.B.
   H.B.
5. Hadrat Abū Bakr as-Siddiq
6. Hadrat 'Umar al-Faruq
7. Hadrat 'Uthmān ibn 'Affān
8. Hadrat 'Ali al-Murtaza
9. A Short Handbook of Fiqh
10. What's in a Muslim Name
11. Animal Sacrifice in Islam
12. What Islam Gave to Humanity
13. Bilāl, The First Mu'adhdhin of Prophet of Islam
14. Bilāl in Hadith
15. Bilāl, The First Moezzin of Islam
16. The Call to Islam
17. The Miracles of Prophet Muhammad
18. Who was Muhammad
19. Qur'ānic Arabic
20. Primer of Islam, Part I
21. Had You been born a Muslim
22. Religion and Social Responsibility
23. Al-Furqan (Arabic)
24. Glimpses of Islamic History
25. What Bible Says about Muhammad

BOOKS UNDER PRINT

26. The Prescribed Islamic Prayer—*Salāt* (*with Arabic Text and Khutbat of Jum'a and 'Id Prayers*)
27. Selection from the Holy Qur'ān and Hadith

The English Translation

of

SAHIH AL-BUKHARI

[With full Arabic Text]

Vol. I—V

Rendered into English

By

Dr. Muhammad Muhsin Khan

Islamic University, al-Medina al-Munawwara

KAZI PUBLICATIONS

121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road

LAHORE - PAKISTAN